ایک جائزہ

عالیہ خاں

Title By : Ghulam Mustafa Daaim
PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

PDF By :

Meer Zaheer Abass Rustmani

Facebook Group Link :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

ادیب و نقاد

ایک جائزہ

عالیہ خاں

نام کتاب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں ادیب و نقاد
۔	ایک جائزہ
نام مصنفہ	عالیہ خاں
زمانہء اشاعت	فبروری ۱۹۹۴عیسوی
تعداد	پانچ سو
صفحات	(۲۳۲)
قیمت	۹۰روپئے
کمپیوٹر کتابت	"اردو کمپیوٹر سنٹر"
۔	17-1-181/M/35 روبرو جامعہ عائشہ نسوان
۔	داراب جنگ کالونی ۔ مادناپیٹ ۔ حیدرآباد ۵۰۰۶۵۹
طباعت	سائی گرافکس آفسیٹ پریس ۔ حیدرآباد

======== ملنے کے پتے ========

ا۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش
گلشن حبیب ۔ اردو ہال ۔ حمایت نگر ۔ حیدرآباد ۲۹
۔ مسکن "6-3-655/3 - IInd Floor ۔ سیول سپلائیز لین
سوماجی گوڑہ ۔ حیدرآباد ۵۰۰۴۸۲ (اے ۔ پی)

فہرست

یہ کتاب

ایچ۔ای۔ایچ۔دی نظامس ٹرسٹ

حیدرآباد

کی

جزوی امداد سے

چھاپی گئی

پیش لفظ

ڈاکٹر یوسف حسین خان کا نام اردو ادب کے قارئین کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اپنی اولین اور معرکتہ الآرا تصنیف "روح اقبال" (۱۹۴۱) ہی سے انہوں نے ایک نکتہ سنج نقاد اور ماہر اقبالیات کی حیثیت سے دنیائے ادب میں اپنا سکہ جمالیا اردو تنقید میں ان کی تصانیف کی تعداد گو پانچ چھے سے زیادہ نہیں ہے لیکن یہ سب تحریریں اتنی وقیع، بلند پایہ اور جامع ہیں کہ اردو ادب و تنقید کی شاندار روایت کا حصہ بن چکی ہیں۔ "روح اقبال" کی اشاعت کو آج پچاس سال سے اوپر ہو چکے ہیں لیکن تفہیم اقبال کے باب میں آج جو بھی حیثیت "روح اقبال" کو حاصل ہے وہ کسی دوسری تصنیف کو حاصل نہیں ہو سکی۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں ایک ایسے خاندان کے چشم چراغ تھے جس کا سارا ماحول علمی و ادبی تھا۔ لہٰذا کم عمری ہی سے انہیں ادب، شاعری، تہذیب و تمدن اور دیگر علوم سے شغف پیدا ہو گیا لیکن شاعری نے خاص طور پر انہیں اپنے دام میں جکڑ لیا کیونکہ اقبال، غالب، حافظ اور حسرت کی شاعری ان کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کرتی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ گو ڈاکٹر صاحب نے اردو، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں کئی موضوعات پر طبع آزمائی کی جس سے ان کی ہمہ جہتی شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن ان کی اصل شناخت اردو زبان میں ان کی تنقیدی تصانیف ہی کے حوالے سے قائم ہوتی ہے۔

تنقید، دانش وری کی روایت کا وہ بڑا دھارا ہے جس میں ایک طرف سارے علوم، ادبیات اور فنون آکر مل جاتے ہیں اور دوسری طرف کلچر کی رنگا رنگی اس میں تنوع پیدا کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں تنقید کے اس دبستان فکر سے تعلق رکھتے ہیں جس میں جمالیاتی اور تاثراتی رجحانات زیادہ ملتے ہیں۔

فراق گورکھپوری کی تنقید کے بارے میں لکھتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی ایک جگہ کہتے ہیں "شاعروں کے بارے میں فراق کی تنقیدوں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا

ہے کہ شاعر اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ آپ کے سامنے آگیا ہے اور اب آپ اس کی شاعری سے پہلے سے کہیں زیادہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں ۔ فراق کا انداز نظر، ان کی باتیں آپ کے اندر آسودگی پیدا کرتی ہیں، بہت سے مسائل اور سولات جو آپ کے ذہن یں موجود نہیں تھے اور اگر تھے بھی تو پوری طرح واضح نہیں تھے فراق کی تنقید پڑھ کر واضح اور صاف ہو جاتے ہیں ۔ اس طرح شاعر کی نہ صرف انفرادیت آپ کے سامنے آجاتی ہے بلکہ دوسرے شعراء سے اس کا تقابل بھی واضح ہو جاتا ہے ۔" حرف بہ حرف یہی بات ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تنقیدوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے ۔ چاہے ہم "روح اقبال " کا مطالعہ کر رہے ہوں یا " غالب اور آہنگ غالب " ۔ حسرت کی شاعری " یا " حافظ اور اقبال " کا ، ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ شاعر اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ہمارے روبرو آکھڑے ہوئے ہیں ۔ ان شاعروں کا انداز فکر، ان کی لفظیات، ان کا وجدان اور ان کی تخیلی اڑان گویا ہمارے محسوسات اور حافظے کا حصہ بن جاتی ہیں ۔

اس کتاب میں عالیہ خان نے ڈاکٹر یوسف حسین خان کی تنقیدی اور تحقیقی تصانیف کا تفصیلی جائزہ لیا ہے ۔ اور اپنے اس مطالعے کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب کی ناقدانہ حیثیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس کے علاوہ انہوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے ابتدائی حالات، ان کی تعلیم و تربیت کا پس منظر اور دیگر تفصیلات جمع کی ہیں جن سے یوسف حسین خاں کی شخصیت اور ان کے انداز فکر کو بہتر طور پر سمجھنے مں مدد ملتی ہے ۔

مجھے قوی امید ہے کہ مصنفہ کی یہ کوشش دنیائے ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی ۔

خورشید عالم خان
راج بھون
بنگلور

عرض حال

ڈاکٹر یوسف حسین خاں تو راتیخ کے طالب علم اور استاد تھے۔ مورخ کی حیثیت سے ان کا مرتبہ اہم ہے۔ مثال کے طور پر Glimpes of Medival Indian Cultur اور Selected Document from Aligerh the Archieves

یہ دو کارنامے ہی انھیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ مگر ان کی فطرت شعر و ادب کی طرف مائل تھی۔ اسی لیے اپنے دور طالب علمی سے ہی وہ باقاعدہ اردو، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی ادبیات کے مطالعہ سے اپنے ذوق کی آبیاری کرتے رہے۔ صرف مطالعہ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ کئی گراں قدر ادبی تصانیف کی صورت میں اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اردو والے ان کی فکر و نظر سے استفادہ کرنے کے باوجود جب کبھی اردو تنقیدی نگاری یا ادبیات جائزہ لیتے ہیں تو ان کا ذکر کم ہی ہوتا ہے۔ گویا غیر شعوری طور پر انھیں مورخ مان کر بہ حیثیت ادیب و ناقدان کے ذکر سے گریز کرتے رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا رہا اس کا تجزیہ کرنا میرا منصب نہیں۔ میں نے تو اپنے خاندانی تعلق کی وجہ سے انھیں خراج تحسین پیش کرنے کا فریضہ ادا کیا ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ اردو والوں نے ان کے کارناموں کے اعتراف میں غفلت برتی ہے۔ اسی لیے اسے میں نے اپنا فریضہ سمجھا کہ اسی موضوع پر ایک کتاب لکھنے کی جسارت کی جائے اور اس میں ان کے حالات اور دوسری تخلیقات کو بھی

شامل کر لیا جائے ۔ ان کی قدر آور شخصیت اور وقیع کارناموں کے مقابلے میں میری حیثیت بے بضاعت ہی مگر کوشش کرنے میں مضائقہ نہیں ۔ چنانچہ میں نے ان کی شخصیت ، ادبی ذوق ، تنقید ، محنت و جستجو اور تخلیقی صلاحیت پر اپنی بساط بھر روشنی ڈالنے کی ہمت کی ۔ ممکن ہے کہ اسے ناکافی سمجھ کر آگے چل کر ہمارے بلند پایہ نقاد اور اہل قلم اس کی تلافی کریں ۔

اس کتاب کو ایک بڑی شخصیت کے لیے ایک عقیدت مند پوتی کا خراج عقیدت سمجھا جائے ۔ اسے کوئی ماہرانہ جائزہ یا وقیع تنقید سمجھ کر اس کوشش کو مضحکہ خیز جسارت ثابت نہ کیا جائے ۔ ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ان کے سنین اشاعت کو ملحوظ رکھا ہے

اس سلسلہ میں یہ میرا فرض ہے کہ محترمہ رفیع رؤف صاحبہ مرحومہ کا ذکر ضرور کروں جن کے مشوروں اور رہنمائی نے مجھے اس راستہ پر چلنے کی ہمت بخشی ۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر اس کتاب کا اشاعت پذیر ہونا ان کی خوشی کا باعث ہوتا یہی احساس میرے لیے عین مسرت اور افتخار کی بات ہے ۔

میرے والد کے ماموں اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے برادر نسبتی جناب خورشید عالم خاں صاحب نے اس کا پیش لفظ لکھ کر اس کتاب کی قدر و قیمت بڑھادی ۔ یہاں اس بات کی بھی وضاحت کر دوں کہ ان کے تعاون اور ہمت افزائی کی بدولت ہی یہ کتاب منظر وجود پر آسکی ۔ ان کی شفقت اور عنایت کا شکریہ ادا کرنے کی طاقت نہ میری زبان میں ہے نہ قلم میں ۔ لیکن اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ یقیناً وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس پرآفات دنیا میں وہ ہماری پناہ گاہ ہیں ۔

عالیہ خاں

حیدرآباد

میں اس ناچیز تصنیف کو اپنی والدہ (بلقیس خانم صاحبہ) اور والد (امتیاز حسین خاں صاحب) کے نام معنون کرتی ہوں ۔ جن کو مرحوم لکھنے کے لیے آج بھی دل آمادہ نہیں ۔ انھی کی محبت اور تربیت نے مجھے یہاں تک پہنچایا۔

عالیہ

ڈاکٹر یوسف حسین خاں
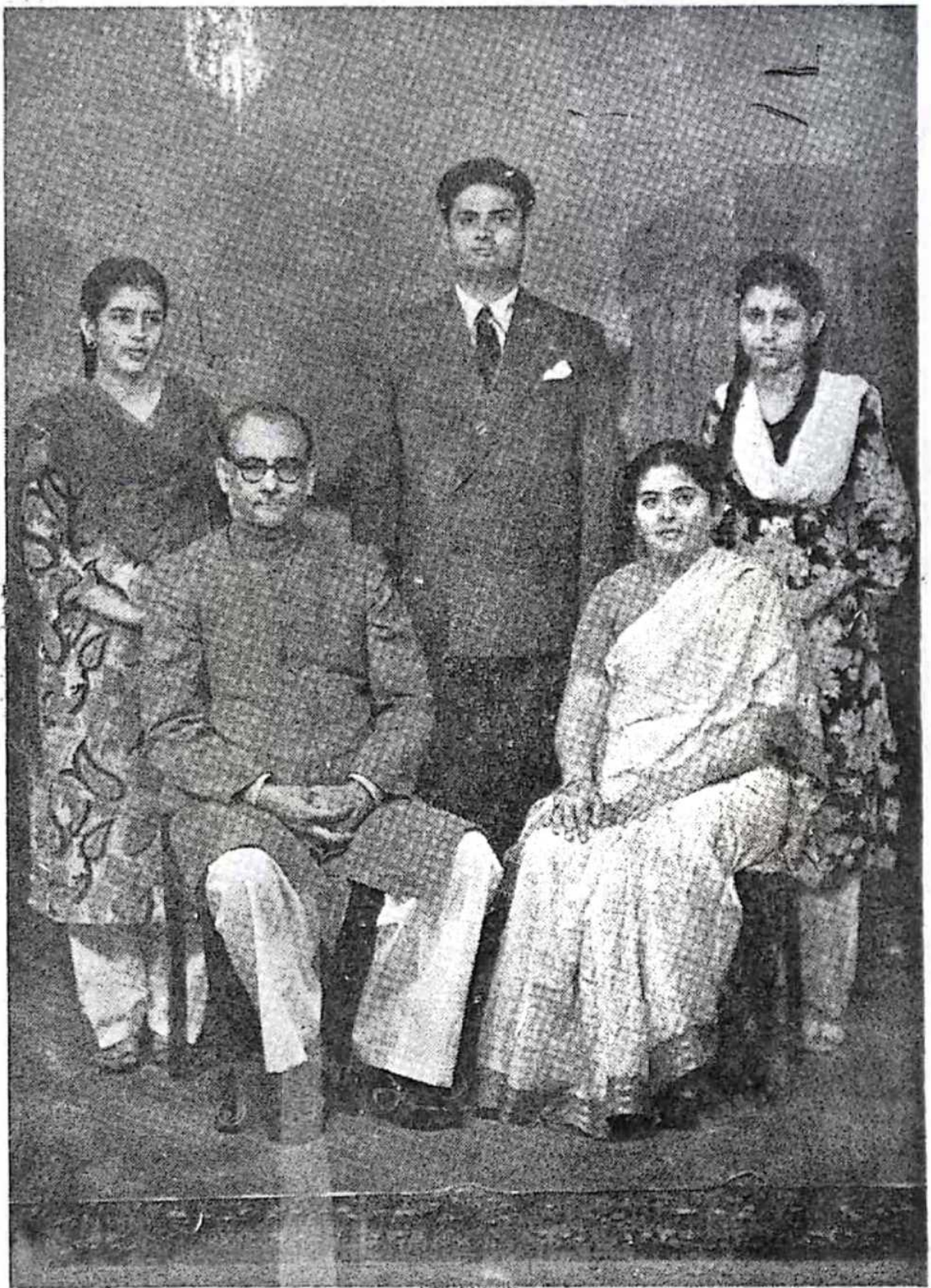
تاریخ پیدائش ۱۸ر ستمبر ۱۹۰۲ء

تاریخ وفات ۲۱ر فروری ۱۹۷۹ء

ماہرو بیگم　　اجمل حسین خان　　راشدہ بیگم

راحت بیگم　　یوسف حسین خان

۱۹۵۶ء

زاہد حسین خان　ذاکر حسین خان

عابد حسین خان　فدا حسین خان　عطا حسین خان　مظفر حسین خان

یوسف حسین خان

۱۹۰۷ء
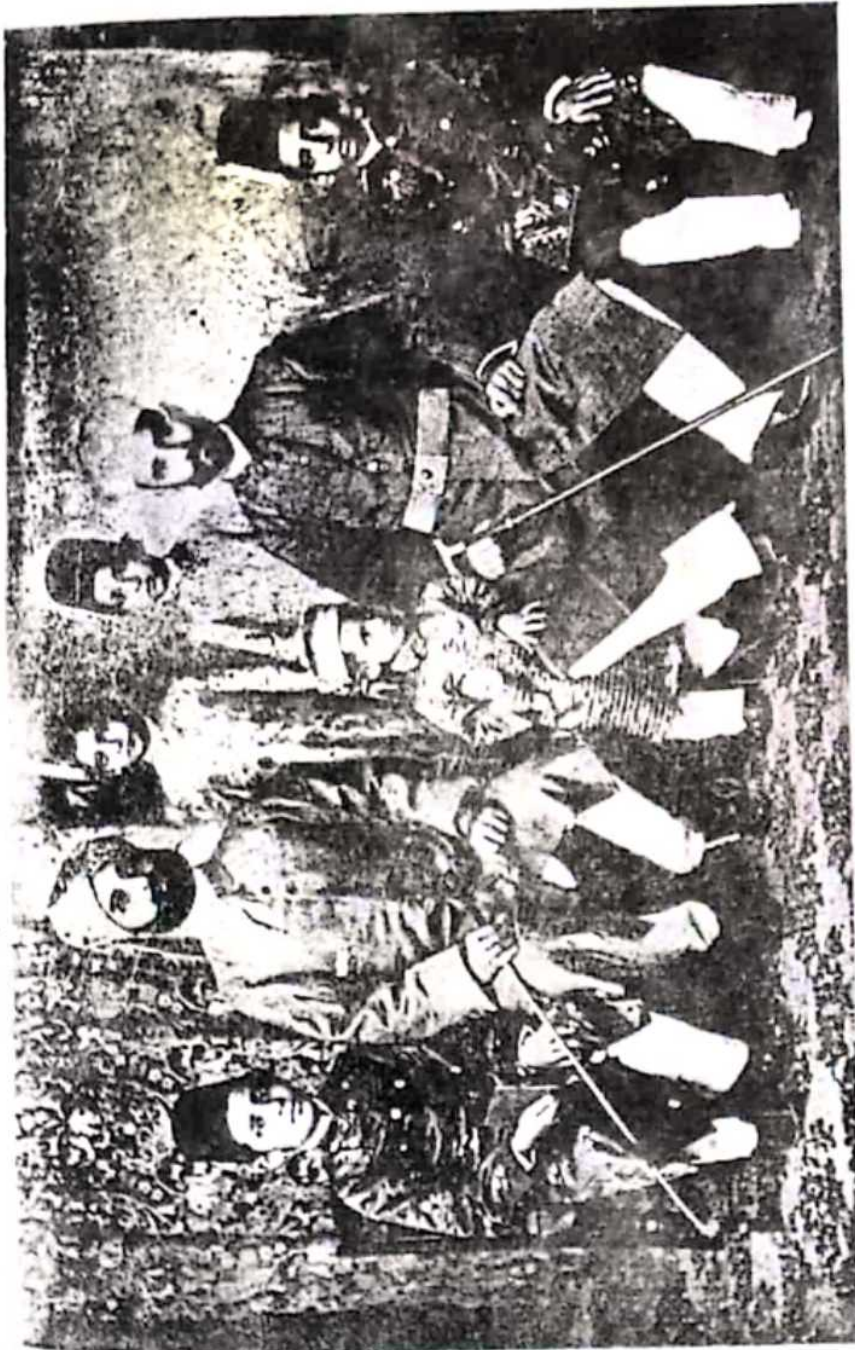
ڈاکٹر محمود حسین خاں کی بڑی صاحبزادی کی شادی پر لی ہوئی ایک یادگار تصویر

استادہ۔ دائیں سے بائیں امتیاز حسین خاں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ ڈاکٹر محمود حسین خاں۔ انور حسین خاں اور طارق حسین خاں کرسیوں پر دائیں سے بائیں بیگم ذاکر حسین۔ ضیاء الدین خاں۔ تنویر۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ بیگم محمود حسین
نیچے بیٹھے ہوئے یاسمین بیگم۔ ثاقبہ بیگم۔ رشیدہ بیگم۔ سعیدہ بیگم۔ صفیہ بیگم

حالات زندگی

وطن

محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں دربار تو آراستہ رہتا تھا لیکن تمام علاقے بدامنی اور بدانتظامی کا شکار تھے۔ اس لیے کارکرد سپاہیوں کی ضرورت بھی تھی اور قدر بھی۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ جس علاقے میں کسی بھی علم، فن یا شئے کی مانگ بڑھ جائے تو دوسرے علاقوں سے جہاں وسائل اور افراد کی بہتات ہو، رسد پہنچنے لگتی ہے۔ چنانچہ طلب اور رسد کا یہ قانون اس دور میں بھی کارفرما نظر آتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بیرون ہند سے ایرانی، تورانی اور پٹھان جوق در جوق ہندوستان کا رخ کرنے لگے۔ ترک وطن کرنے والوں کو دو چیزیں اکساتی ہیں ایک تلاش معاش دوسرے مہمات پسندی سب سے پہلے ایسے ہی لوگ ترک وطن کرتے ہیں اور نئی بستیاں بساتے ہیں جن میں حوصلہ مندی ہوتی ہے۔ افغانوں اور پٹھانوں میں ایک طریقہ یہ بھی رہا ہے کہ کسی منچلے کے فیصلے پر پورا خاندان یا قبیلہ ترک وطن کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

افغانوں اور پٹھانوں کی یہ بستیاں زیادہ تر گنگا جمنا کے دوآبے کے قریب آباد ہوئیں۔ تاکہ اس علاقے میں سرکشی نہ ہو سکے اور فاضل اوقات میں یہ زراعت میں

مشغول رہ کر پیداوار میں اضافہ کر سکیں ۔ایسی ہی ایک بستی قائم گنج ضلع فرخ آباد میں بھی ہے ۔قائم گنج کے پٹھانوں میں مدہ آخون کا خاندان بہت نامور رہا ہے اور آج بھی اس خاندان کی شہرت اس لیے بھی ہے کہ کئی قابل فخر افراد اس میں پیدا ہوئے ۔ صرف ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام لینا ہی اس بات کی توثیق کے لیے کافی ہے ۔

۱۷۲۳ء میں محمد خاں بنگش نے اپنے بڑے بیٹے قائم خاں کے نام سے قائم گنج بسایا تھا اور بادشاہ فرخ سیر کے نام سے فرخ آباد کی بنا، ڈالی ۔قائم گنج ڈھائی تین سو سال سے ایک منڈی کی حیثیت سے بھی بہت مشہور رہا ہے ۔اسی خاندان کے زمانے میں سرحدی قبائل کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور اس علاقہ میں زیادہ تر خٹک اور آفریدی پٹھانوں کے قبائل آئے ۔ان آفریدیوں نے یہ بستیاں اور محلے قائم گنج میں بسائے ۔ چنانچہ آج بھی وہ محلے اپنے قبیلوں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں ۔

خاندان

۱۷۱۵ء کے لگ بھگ دو بھائی حسن خاں اور حسین خاں اپنے خاندانوں کے ساتھ وارد ہندوستان ہوئے ۔ان کی اولاد آج تک اپنے ناموں میں حسن خاں اور حسین خاں کی نسبت سے پہچانی جاتی ہے ۔ حسین خاں کا لقب، مشغلہ، درس و تدریس کی وجہ سے مدہ آخون تھا اور ہندوستان آنے سے پہلے ہی یہ لقب انہیں مل چکا تھا ۔کہتے ہیں کہ وہ سو یا ایک سو بیس سال کی عمر تک پہنچے اور آخری عمر تک پڑھنے اور پڑھانے میں مشغول رہے ۔انہوں نے مؤ کے پٹھانوں کی کئی پشتوں کو تعلیم دی ۔ چونکہ وہ استاد اور عالم ہونے کے علاوہ صوفی بھی تھے کئی لوگ ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے ۔قائم گنج کے قدیم قبرستان میں آج بھی ان کا مزار مرجع خلائق ہے اور لوگ ابھی تک اس پر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں ۔ان ہی مدہ آخون کی اولاد میں یوسف حسین خاں کے دادا غلام حسین خاں ہوئے ہیں جو اپنی حق پسندی، صاف گوئی

شجاعت اور سخاوت میں مشہور تھے۔ دشمنوں کے غضب ناک دشمن اور کمزوروں کے رحمدل سرپرست۔ ان کے مزاج میں شعلہ و شبنم یک جاں ہو گئے تھے۔ وہ سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ حیدر آباد کی ریاستی فوج میں ملازم تھے اور افسر الملک کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ترک موالات کے بعد قائم گنج آگئے۔ انہیں درویشوں اور اللہ والوں سے بہت محبت تھی۔ ایک طرف انہیں زمانے کے مقبول درویش کرم علی شاہ میاں سے عقیدت تھی تو دوسری طرف کبیر پنتھی بنس بہاری سے بھی عقیدت رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ غلام حسین خاں کا خاندان ان ہی دو درویش صفت لوگوں کی دعاؤں سے پھولا پھلا۔ یوسف حسین خاں کے نانا نبی داد خاں پیشہ تو سپہ گری کا رکھتے تھے لیکن طبیعت میں بے حد انکساری اور بردباری تھی۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کسی کا نہ دل دکھایا اور نہ کوئی ان کا دشمن تھا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ دادا کی طبیعت کا جلال نانا کے مزاج کا جمال ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور ان کے بھائیوں کو وراثت میں ملا۔

والد

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے والد فدا حسین خاں غلام حسین خاں کے بیٹے تھے قائم گنج کے تحصیلی اسکول میں پڑھنے کے بعد ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد چلے آئے۔ ان کو پڑھنے لکھنے کا بھی شوق تھا۔ طبیعت میں خوش ذوقی اور نفاست تھی۔ بہت کم گو اور سنجیدہ انسان تھے۔ حیدر آباد آکر مرادآبادی برتنوں کا کاروبار کرنے لگے مگر دل کتابوں میں رہا۔ چنانچہ بیگم بازار میں ان کے گھر کے قریب شمالی ہند کے ایک وکیل رہتے تھے ان کے کتب خانے سے استفادہ کرنے لگے۔ قانونی امور سے دلچسپی ہوئی تو وکالت کا امتحان دیا۔ بڑی محنت اور دیانت سے وکالت کی۔ وکالت چل نکلی تو اسے اور چمکانے کی خاطر اورنگ آباد چلے گئے۔ جہاں قائم گنج کے کچھ خاندان آباد تھے۔ انہوں

نے "آئین دکن" کے نام سے ایک قانونی رسالہ جاری کیا جس کی جلدیں ہر وکیل کے کتب خانے کی زینت بنیں۔ جب شہرت کافی پھیل گئی اور قدم جم گئے تو دوبارہ حیدرآباد آگئے۔ بیگم بازار میں ایک دو منزلہ مکان بنایا جہاں نیچے دفتر، کتب خانہ اور اوپر رہائش تھی (۱) "آئین دکن" کے لیے ایک مطبع بھی قائم کیا۔ قانونی کتابوں کی فروخت سے کافی فائدہ ہونے لگا۔ سولہ سال وکالت کی۔ قائم گنج میں بھی پکا مکان بنوالیا تھا اور بڑی کامیاب زندگی گزار رہے تھے کہ ۳۹ سال کی عمر میں دق کے موذی مرض نے آگھیرا۔ آرام اور علاج کی خاطر قائم گنج آگئے اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

بھائی

یوسف حسین خاں کے کل سات بھائی تھے اور ان کی والدہ ست پوتی کہلاتی تھیں۔ ایسی عورتیں بڑی خوش قسمت سمجھی جاتی ہیں مگر ماں تو ماں ہوتی ہے انہیں ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ سات بیٹے ایک سے ایک خوبصورت اور دیدارو۔ مگر ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہو۔ ان میں سے سوائے تین کے عمر طبعی کو کوئی نہ پہنچا۔ سات بھائیوں کے نام ترتیب وار یہ ہیں۔

مظفر حسین خاں، عابد حسین خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، زاہد حسین خاں، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، جعفر حسین خاں اور ڈاکٹر محمود حسین خاں۔ ان میں سے جعفر حسین خاں ماں کے ساتھ طاعون کی نذر ہوگئے۔ عابد حسین خاں عین جوانی میں رخصت ہوگئے۔ زاہد حسین خاں جو سب سے خوبصورت و تندو مند تھے اٹھارہ سال کی عمر میں چل بسے۔ مظفر حسین خاں چالیس تک نہیں پہنچے مگر اپنے پیچھے آل اولاد چھوڑ گئے۔ جن کی پانچ اولادوں میں سے تین نے زندگی پائی۔ ان کے بڑے بیٹے امتیاز حسین خاں میرے والد تھے۔ جو عثمانیہ یونیورسٹی میں معاشیات کے استاذ اور شعبہ کامرس کے بانی تھے۔ وظیفہ پر سبکدوش ہونے سے پہلے ہی چل بسے۔ ۱۸/ مارچ ۱۹۶۶ء کو

جب وہ سکندر آباد کالج کے پرنسپل تھے کالج ہی میں دل کا دورہ پڑا اور انتقال ہو گیا۔ پھوپی خدیجہ زوجہ احمد شاہ خاں وہ بھی اب مرحوم ہو گئی ہیں۔ صرف چچا ڈاکٹر مسعود حسین خاں پروفیسر اردو و لسانیات اور سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) بقید حیات ہیں۔ جو اپنی تصانیف اور تالیفات کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ۷۲ سال تک پہنچے۔ اور سن ۱۹۶۹ء میں وفات پائی۔ ڈاکٹر محمود حسین خاں وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی نے تقریباً ۷۰ سال کی عمر پائی اور ان کا انتقال ۱۹۷۵ میں ہوا۔ اور فدا حسین خاں کی آخری یادگار ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے ۷۳ سال کی عمر پائی اور ان کا انتقال ۱۹۷۹ء میں ہوا۔ فخر خاندان ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی تعلیمی اور سیاسی خدمات کی وجہ سے بہت نام کمایا اور صدر جمہوریہ ہند بنے اور قصر جمہوریت میں ہی داعی اجل کو لبیک کہا۔

والدہ

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی والدہ کا نام نازنین بیگم تھا جو وجو کہلاتی تھیں۔ ان کا کوئی بھائی نہ تھا۔ بس تین بہنیں تھیں۔ والدہ کی طبیعت میں بے حد نرمی تھی۔ بچوں سے غیر معمولی محبت رکھتی تھیں۔ والدہ کے انتقال کے بعد تو ان کی ساری محبت اور توجہ کا مرکز صرف بچے رہ گئے تھے۔ انہیں اپنے بیٹوں پر ناز بھی تھا ٹوٹ کر محبت بھی کرتی تھیں مگر بچوں کی تربیت سے غافل بھی نہ رہیں۔ چھٹیوں میں جب بچے گھر آتے تو انہیں خاندان کے بزرگوں کے پاس اصرار سے بھیجتیں کہ انہیں سلام کر آؤ اور کہتیں کہ بزرگوں کی دعا سے بچوں پر برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

بچپن

یوسف حسین خاں ۱۸/ ستمبر ۱۹۰۲ء کو حیدر آباد کے بیگم بازار والے مکان میں پیدا ہوئے۔ یہ اپنے ماں باپ کی پانچویں اولاد تھے۔ والد کی علالت کی وجہ سے چار پانچ

سال کی عمر ہی میں قائم گنج آ گئے۔ مولوی صاحب سے گھر پر قرآن شریف اور اردو پڑھنے لگے اور نو سال کی عمر میں اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ بچپن میں فٹبال بھی کھیلا، پتنگ بھی اڑائی اور گلی ڈنڈے سے بھی دل بہلایا مگر دماغ میں علم کی خوشبو بسی تھی اور دل شاعرانہ پایا تھا۔ گھر کے چاروں طرف آموں کے باغ ہی باغ تھے۔ جہاں انہوں نے خالص خاموشی، سناٹے کی سنسناہٹ، روشنی اور تاریکی کی طلسمی فضا کو محسوس کیا تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

> "میں کبھی مغرب کے کچھ دیر بعد کوٹھی کے باہر چبوترے پر ٹہلنے نکلتا سناٹا اور تاریکی مل کر طلسمی فضا پیدا کر دیتے جس میں طبیعت گھبراتی نہیں تھی۔ بلکہ اس میں دل لگتا تھا۔ قائم گنج کے بعد مکمل سکوت اور مکمل تاریکی کا احساس پھر کبھی نہیں ہوا بعد میں جہاں کہیں رہنا ہوا وہاں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دور سے آنے والی کوئی آواز نہ سنائی دیتی ہو یا کچھ فاصلے پر ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر نہ آتی ہو۔" (۲)

یہ ابھی اٹاوہ میں داخل ہوئے ہی تھے اور بچپن پوری طرح لڑکپن میں نہ بدلا تھا کہ ایک دن ہیڈ ماسٹر الطاف حسین نے بلا کر ادھر ادھر کی کچھ باتیں کیں اور پھر ماں سے محرومی کی روح فرسا خبر سنائی وہ سن کر رونے لگے یہاں تک کہ ہچکی بندھ گئی اور پھر بورڈنگ ہاؤس جا کر لیٹ گئے اور چادر میں منہ چھپائے دیر تک روتے رہے۔ والدہ کے انتقال کے بعد تنہائی کے احساس نے ان کے دل میں دردمندی پیدا کر دی گھر، گھر والوں سے ہوتا ہے۔ جب گھر میں ہو کا عالم ہو تو دل دوسرے مشغلوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ یہ ایک اچھی بات تھی یوسف صاحب نے کتابوں میں پناہ ڈھونڈی اور سیر و سیاحت سے دل بہلایا۔ لڑکپن کے لیے چھوٹے چھوٹے سفر بھی ان کی

مشاہدے کی حس کو سان پر چڑھاتے رہے۔

تعلیم

اٹاوہ سے جب بڑے بھائی آگے تعلیم کے لیے علی گڑھ آگئے تو یوسف صاحب بھی وہیں منتقل ہوگئے۔یہ علی گڑھ کے اسکول میں داخل ہوگئے۔اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر ایف۔اے۔کوپر وظیفہ یاب فوجی تھے اس لیے اسکول کا نظم و ضبط عمدہ تھا اور کھیلوں کا بھی خاص اہتمام تھا۔بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔بھائیوں کی نگرانی بھی تھی۔چنانچہ وہاں کے قیام سے فیض ہی اٹھایا بگڑے نہیں۔بورڈنگ ہاؤس میں رہ کر آدمی سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنی تنہائی کی حفاظت کرنا سیکھ جاتا ہے۔۱۹۲۸ء میں یوسف صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی محمود صاحب علی گڈھ سے دوبارہ اٹاوہ آگئے۔وہ علی گڈھ اور اٹاوہ کے استادوں میں شاید سب سے زیادہ سید الطاف حسین صاحب سے متاثر ہوئے چنانچہ لکھتے ہیں۔

> "سید الطاف حسین ایک نیک سرشت انسان تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی شخصیت کے اندر سے نیکی کی شعاعیں باہر نکل رہی ہوں اور ان سبھوں کے دل و دماغ کو روشن کر رہی ہوں جو کسی حیثیت سے بھی ان سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی نیکی اور شرافت ان کے سب شاگردوں کو یاد ہے۔
>
> (۳)

ایک سال بعد یوسف صاحب کی صحت خراب ہو گئی۔انہیں واپس قائم گنج آرام اور علاج کے لیے آنا پڑا۔کہنے کو تو دو سال بیکاری میں گزرے مگر قائم گنج اور قائم گنج والوں کو دیکھنے سمجھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ڈاکٹروں، حکیموں کے علاج کے

ساتھ ساتھ اپنے ایک بزرگ عزیز محمد مبین خاں سے ورزش سیکھی جس سے بہت فائدہ ہوااور اس سے کہیں زیادہ فیض اس اہل دل انسان کی محبت سے پہنچا۔اس کا اثر ان کی شخصیت پر ہمیشہ باقی رہا۔قائم گنج ہی کے زمانے میں انھیں عام مطالعہ کا چسکا لگا۔ چنانچہ خود اعتراف کرتے ہیں۔

"اس عرصہ میں جتنا پڑھا پہلے کبھی نہیں پڑھا تھا۔" (۴)

جب صحت ٹھیک ہوئی تو وہ اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین کی رائے سے جولائی ۱۹۲۱ء میں جامعہ میں داخل ہوئے جہاں ذاکر صاحب پہلے سے موجود تھے۔جامعہ کا داخلہ گویا ان کی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔ صبح کی ہواخوری اور ہلکی کثرت یہاں بھی جاری رہی لیکن قائم گنج کا سا عمدہ کھانا یہاں کیسے ملتا۔چنانچہ پھر صحت خراب ہو گئی۔ ویسے تین بڑے بھائیوں کا ایک کے بعد دیگرے دق میں انتقال ہو چکا تھا اس لیے گھبرانا ضروری تھا۔ذاکر صاحب نے ڈاکٹر انصاری کے پاس تشخیص کے لیے بھیجا۔ ڈاکٹر انصاری مسیحائے وقت سمجھے جاتے تھے۔انہوں نے طاقت کی کچھ دوائیں دیں اور اطمینان دلایا کہ صحت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔جس کا نفسیاتی اثر بہت اچھا ہوا۔ جامعہ کے دوران تعلیم مختلف اساتذہ اور ساتھی طالب علموں سے ربط ضبط نے اس کا یوسف صاحب کی شخصیت کو بنانے میں نمایاں رول رہا ہے۔

یوسف صاحب جامعہ میں تقریباً پانچ سال رہے۔ذاکر صاحب جرمنی گئے تھے جب ۱۹۲۶ء میں وہ جرمنی سے لوٹے تو یوسف صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس روانہ ہو گئے۔ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے فرانسیسی سیکھ لی تھی۔لیکن پیرس جا کر اور زیادہ محنت کرنی پڑی۔جامعہ کی طالب علمی کے دوران وہ اس قابل ہو چکے تھے کہ یورپ کے کسی بھی ملک میں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔

اکتوبر ۱۹۲۶ء میں ہی ان کا داخلہ پیرس یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لیے ہوا اور یونیورسٹی کے قریب ہی ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہنے لگے۔وہ ڈاکٹریٹ تو کر رہے

تھے تاریخ میں مگر کبھی کبھی ادب، تنقید اور فلسفہ کے لکچر بھی اٹنڈ کر لیتے تھے ۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد سوربوں یونیورسٹی انسان دوستی کا زبردست مرکز بن گئی تھی ۔ اس لیے سارے یورپ سے طالب علم یہاں کھنچ چلے آتے ۔ اس ماحول کا بھی ان کی شخصیت پر بہت اچھا اثر ہوا ۔ ۱۹۲۹ء میں انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی اور جنوری ۱۹۳۰ء میں ہندوستان واپس آگئے ۔ دوران قیام فرانس کو اچھی طرح سے دیکھا ۔ فرانسیسی ادب کا اچھی طرح مطالعہ کیا ۔ وہاں کے قابل پروفیسروں سے استفادہ کیا ۔ فطری اور انسانی حسن کے نظارے دیکھے، وہاں کی روشن خیالی سے متاثر ہوئے ۔ وہاں کی تہذیبی اور ادبی تحریکوں کی سوجھ بوجھ حاصل کی ۔ ان کے نئے نئے ادبی اور سیاسی تجربوں کو اچھی طرح سمجھا اور پرکھا اور بہت سی دلچسپ شخصیتوں سے ملاقات رہی ۔ موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور سری نواس آئنگار سے ان کی ملاقات یہیں ہوئی ۔ وہ اٹلی دیکھنے بھی گئے، ایک تاریخ کے طالب علم کے لیے وہاں کشش بھی بہت تھی ۔

ملازمت

یورپ کے دوران قیام ہی میں ان کی ملاقات مہاراجہ بڑودہ سے ہوئی اور انہوں نے اپنی ریاست میں ملازمت کی ترغیب بھی دی ۔ ۱۹۳۰ء میں جب وہ ہندوستان آئے تو ذاکر صاحب نے رائے دی تھی کہ وہ حیدرآباد جائیں ۔ ایک تو یہ کہ تین پشتوں سے اس خاندان کا تعلق حیدرآباد سے رہا ہے اور یوسف صاحب کی پیدائش خود حیدرآباد کی ہے ۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو تھا اور ذاکر صاحب کی جوہر شناس نظر نے بھانپ لیا تھا کہ یوسف صاحب کا مزاج اردو ادب اور شاعری سے ہم آہنگ ہے اس لیے انہوں نے یہ رائے دی تھی ۔

"ذاکر صاحب کی یہی رائے تھی کہ یہ ایک نیا تجربہ
ہے عثمانیہ یونیورسٹی کا ۔ اردو زبان میں تعلیم کا، اور

تمہیں اردو ادب سے دلچسپی ہے۔" (۵)

یوسف صاحب حیدرآباد آگئے۔ اتفاق سے پروفیسر ابن حسن صاحب جو تاریخ سے تعلق رکھتے تھے ان دنوں لندن گئے ہوئے تھے ان کی جگہ عارضی طور پر ان کا تقرر ہوا۔ وہ واپس آئے تو بیمار رہے اور پھر ان کا انتقال ہو گیا اور یوسف صاحب کی عارضی ملازمت مستقل ہو گئی۔ اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ کے ہر شعبہ میں بڑے قدآور اساتذہ جمع تھے۔ یوسف صاحب نے ان کے درمیان اپنے آپ کو بہت اچھی طرح سمولیا۔ درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی شوق پورا کرتے رہے تقریباً ۲۸ سال گزارنے کے بعد ۱۹۵۷ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو گئے۔ انہوں نے حیدرآباد کے شاندار محلے بنجارہ ہلز میں اپنا عالی شان ذاتی مکان بھی بنوالیا تھا۔ حیدرآباد میں وہ شاہی خاندان کے اتالیق بھی رہے ہیں۔ وظیفے کے بعد کچھ مہینے تصنیف و تالیف میں لگے رہے، ان سے نچلا نہ بیٹھا جاتا تھا۔ چنانچہ جب پبلک سروس کمیشن نے انڈین نیشنل آرکائز کی ڈائرکٹری کے لیے درخواستیں طلب کیں تو انہوں نے بھی درخواست دے دی۔ حسن اتفاق سے اسی زمانے میں بشیر حسین زیدی نے ان سے رائے مانگی کہ آیا مسلم یونیورسٹی کی اکزیکٹیو کونسل میں ان کا نام پرو وائس چانسلری کے لیے پیش کیا جائے۔ کیونکہ سید نور اللہ کی پرو وائس چانسلری کی مدت ختم ہو رہی تھی۔ ان کے لیے تصفیہ کرنا مشکل تھا کیونکہ دونوں جگہیں ان کی قابلیت کے لیے مناسب تھیں۔ مگر آخر دل نے یہی فیصلہ کیا کہ تعلیم ہی کو ترجیح دینی چاہیے اور انہوں نے علی گڈھ کے حق میں فیصلہ دے دیا اور ۱۹۵۷ء میں وہ پرو وائس چانسلر ہو کر وہاں چلے گئے اور تین وائس چانسلروں یعنی بشیر حسین زیدی، بدر الدین طیب جی اور نواب علی یاور جنگ کے ساتھ کام کیا۔ لیکن آخری دور میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ وہ ۱۹۶۵ء میں علی گڈھ ترک کر کے دہلی چلے آئے۔ دو سال گھر میں بیٹھے اپنے مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا شوق پورا کرتے رہے۔ اس کے بعد ۱۹۶۷ء

میں چار سال کے لیے انسٹیٹیوٹ آف اڈوانس اسٹڈیز میں کام کرتے رہے جہاں انہوں نے INDU-MUSLIM POLICY کے نام سے ایک تحقیقی تصنیف لکھی۔

شملہ سے واپس آکر دہلی ہی میں غالب کی اردو اور فارسی غزلوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا(٦)

غرض آخری دم تک ان کا لکھنے پڑھنے کا شغف جاری رہا۔

شادی

عثمانیہ یونیورسٹی میں کام کے چند ماہ بعد یوسف صاحب کی شادی ۱۴/ دسمبر ۱۹۳۰ء کو قائم گنج کے رئیس جان عالم خاں کی صاحبزادی اور بڑی بھاوج کی بہن راحت بیگم سے ہوئی۔

اولاد

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے پانچ بچے ہوئے۔ایک لڑکا اور چار لڑکیاں۔دو لڑکیاں کم سنی میں ہی فوت ہو گئیں۔ان کے لڑکے اجمل حسین خاں کی شادی امتیاز حسین خاں (ان کے بھتیجے) کی صاحبزادی ڈاکٹر عاصمہ سے ہوئی۔ڈاکٹر عاصمہ آج کل جامعہ ملیہ میں میڈیکل آفیسر ہیں اور دلی میں سکونت پذیر ہیں۔ان کی بڑی لڑکی راشدہ بیگم کی شادی سلیم الدین حیدر سے اور دوسری لڑکی ماہ رو بیگم کی شادی انور حسین خاں (ڈاکٹر محمود حسین خاں کے لڑکے) کے ساتھ ہوئی۔

تصنیف و تالیف

ڈاکٹر یوسف حسین خاں بنیادی طور پر تاریخ کے طالب علم اور محقق تھے اور پیشے کے لحاظ سے بھی آپ کا موضوع تاریخ ہی تھا۔لیکن فطری رجحان ادب کی طرف مائل تھا لہذا دونوں میدانوں میں اپنے اشہب فکر کو دوڑایا اور بڑی مہارت کا ثبوت دیا۔ان کی ہندوستانی تاریخ پر جو کتابیں ہیں وہ بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان

کو انگریزی، فرانسیسی، فارسی اور اردو زبانوں پر یکساں دسترس حاصل تھی ۔اردو اور انگریزی زبان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت تھی اپنی تصانیف میں انہوں نے وسیع علم، عمیق مطالعے اور ہمہ جہتی مشاہدے کے دریا بہائے ہیں۔

(۱) اردو تصانیف

(۱) روح اقبال

(۲) غالب اور آہنگ غالب

(۳) حسرت کی شاعری

(۴) حافظ اور اقبال

(۵) بین الاقوامی غالب سمینار (مقالات)

(۶) غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات

(۷) اردو غزل

(۸) فرانسیسی ادب

(۹) کاروان فکر

(۱۰) تاریخ دستور ہند

(۱۱) تاریخ دکن (عہد حالیہ)

(۱۲) یادوں کی دنیا

(۱۳) گارساں دتاسی کے پندرہ خطبات کا ترجمہ

(۲) فرانسیسی

L "Inde myslique an moen age

(۳) انگریزی کتب

1 - Glimpes of Medivel Indian culture

2 - The first Nizam - The life and time of Nizamul Mulk Asif Jahl

3 - Indo Muslim Policy (Turko - afgan period)

4 - Two studies in early Mughal History

5 - 18-23 Edited six volume of Mughal Documents with Persian text and notes and translated in Engish

6 - Edited Diplomatic correspondance between the Nizam Ali Khan and E.India Company

7 - Edited News Letter 1767 - 1799, Nawab Mir Nizam Ali khans range

8 - Edited Selected documents from the Aligarh Archieves

9 - Edited selected document of Aurangzab.s range 1659 - 1706

10 - Tr. Galib - Persain and Urdu gazal of Galib

(7)

اعزاز اور انعامات

ان کی علمی اور ادبی خدمات کو اہل بصیرت نے سراہا اور ملک و قوم کی طرف سے بطور قدر دانی مختلف اعزازات و انعامات سے نوازا گیا۔

ان کی تصنیف حافظ اور اقبال پر انھیں ملک کا سب سے بڑا ادبی انعام ساہتیہ اکیڈیمی کی طرف سے ۱۹۷۹ء میں عطا کیا گیا۔ ادبی انعام اردو اکیڈیمی لکھنؤ اور ساہتیہ کلا پریشد دہلی کی طرف سے ادبی انعام بھی دیا گیا۔

ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں حکومت ہند کی طرف سے پدم وی بھوشن کا اعزاز عطا کیا گیا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان علمی اداروں میں غیر معمولی دلچپی رکھتے تھے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) سے ان کا بہت پرانا تعلق تھا۔ انتقال کے وقت وہ انجمن کے نائب صدر تھے اور غالب اکیڈیمی کے بھی نائب صدر اور غالب انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کے جنرل سکریٹری بھی تھے

انتقال

ڈاکٹر یوسف حسین خان سدا بہار شخصیت کے مالک تھے جو علمی و ادبی کاموں کو عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔ان کا یہ کام صرف جوانی ہی میں نہیں بلکہ ضعیفی میں بھی اسی رفتار سے چلتا رہا۔انتقال سے پندرہ دن قبل تک یہ شغل جاری رہا۔فبروری ۱۹۷۹ء کو ان کی طبیعت خراب ہوئی۔ہولی فیملی اسپتال دہلی میں شریک کروایا گیا۔جہاں ۲۱۔فبروری ۱۹۷۹ء کو ان کا انتقال ہوا۔ان کی موت خون میں زہریلا مادہ مل جانے سے واقع ہوئی۔ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے ان کے انتقال کی خبر نشر کی۔۲۲۔فبروری کو ظہر کی نماز کے وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مزار کے قریب شفیق الرحمن قدوائی، بریگیڈیر عثمان، خواجہ غلام الیدین اور سید سجاد ظہیر کے مزارات کے جھرمٹ میں ان کے جسد خاکی کو سپرد خاک کیا گیا۔اسی خاک سے آدم کا خمیر تیار ہوا تھا اور اولاد آدم کی قسمت یہی ہے کہ آخر میں اسی خاک میں مل جائے۔کیونکہ سفر حیات کی یہی آخری منزل ہے۔

انا للله وانا الیه راجعون

ان کے انتقال پر اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی نائب صدر بی۔وی۔جھٹی اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے تعزیتی پیامات بھیجے۔ہندوستان کے مختلف اداروں نے بھی تعزیتی جلسے کر کے اردو کے اس مشہور نقاد، غالبیات اور اقبالیات کے ممتاز ماہر کے انتقال کو اردو ادب کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا اور بے شمار مداحوں نے فرداً فرداً اظہار تعزیت کیا خطوط اور ٹیلی گرام روانہ کئے۔

حوالے

---

(۱) اس مکان میں ذاکر صاحب کی پیدائش ہوئی تھی اور کچھ لوگوں نے چاہا کہ اسے قومی یادگار کا درجہ دیا جائے ۔ مگر معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔

(۲) ڈاکٹر یوسف حسین خان، یادوں کی دنیا، صفحہ (۵۱ ۔ ۵۰)
(۳) ڈاکٹر یوسف حسین خان، یادوں کی دنیا، صفحہ (۶۲)
(۴) ڈاکٹر یوسف حسین خان، یادوں کی دنیا، صفحہ (۷۶)
(۵) گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر یوسف حسین خان سے ایک یادگار انٹرویو ۔ ہماری زبان صفحہ (۱)
(۶) شخصی انٹرویو ۔ راحت بیگم (بیگم یوسف حسین)
(۷) نوٹ ۔۔۔

یوسف صاحب نے اپنی کتابوں کی فہرست خود تیار کی تھی جو راقم الحروف کی درخواست پر ان کی بہو ڈاکٹر عاصمہ حسین نے عنایت کی ۔

حسین خاں

احمد حسین خاں

محمد حسین خاں

غلام حسین خاں
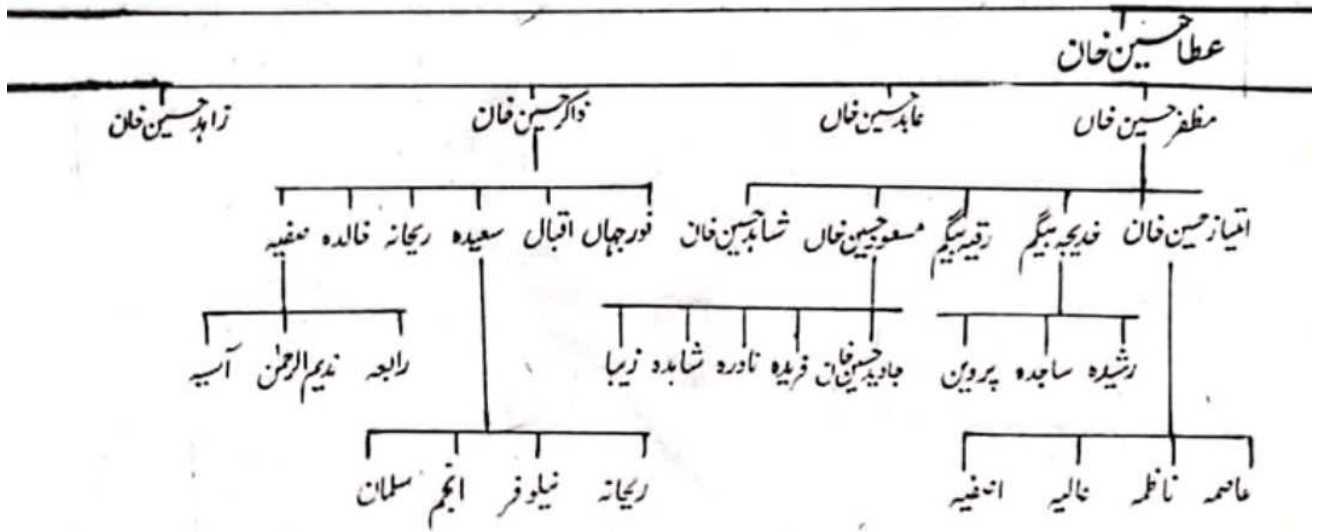
نوٹ: شجرہ ملوکہ محترمہ راحت بیگم صاحبہ (بیگم یوسف حسین خاں) ہے جو راقم الحروف کی درخواست پر مقالہ ہٰذا کے لئے عطا کیا گیا ہے۔

فدا حسین خان
یوسف حسین خان
جعفر حسین خاں
محمود حسین خان
اجمل حسین خاں
راشدہ
فرحت
دُردانہ
مہر
عارف حسین خان
دُردانہ
صبا
عدنان
ریحان
امریٰ
شاھد حسین خان
نجلا
لیلیٰ
فہد
انور حسین خان
تنویر
یاسمین
زرین
عاقبہ
طارق
حسین خان
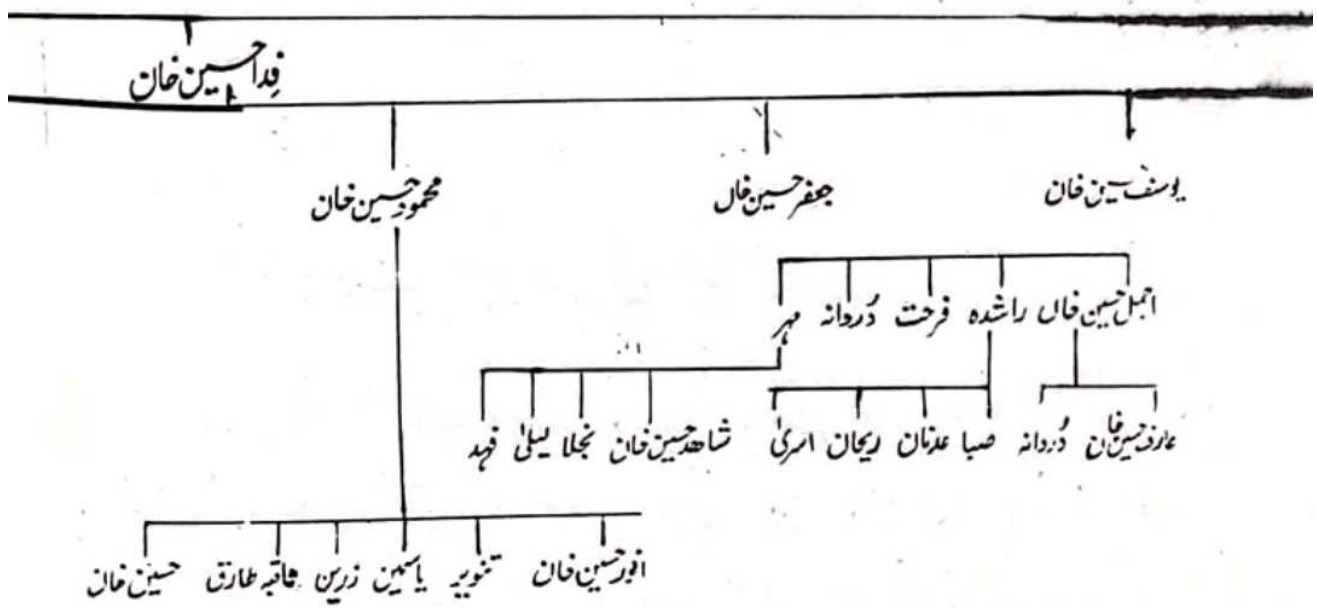
ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تنقید نگاری پر ایک نظر

دنیا میں فن اور ادب کو جانچنے کے لئے ہمیشہ مختلف نظریات کار فرما رہے ہیں کوئی فن کو برائے فن سمجھتا رہا ہے کسی کے لیے فن حسن اور جمالیات کا نام ہے۔ کوئی اس کی مقصدیت پر زور دیتا ہے اور کسی نے فن کو ہی مقصد جانا ہے۔ کچھ حقیقت پسند دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سچائی اور حقیقت کو پیش کرنا ہی فن ہے۔ بعض اس نظریے کے مخالف ہیں۔ جن کا کہنا ہے کہ سچائی کو جیسی ہے اس کو اسی طرح پیش کر دینا فن نہیں بلکہ فن کا مقصد یہ ہے کہ سچائی کو بہتر اور مثالی بنا کر پیش کریں۔

دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو حسن سے ناآشنا اور احساس جمال سے بیگانہ رہا ہو اور یہی احساس جمال اس کو شئے کی ماہیت اور حقیقت کا پتہ لگانے پر مجبور کرتا رہا۔

جمالیاتی ذوق ورثہ ، ماحول اور تربیت وغیرہ کا رہین منت ہوتا ہے۔ سقراط سے پہلے قدیم یونانی تصور جمالیات یہ تھا کہ ہر شئے کا نظارہ ہمیں ازلی حسن کی یاد دلاتا

ہے اور یہی سر چشمہ ہے اس پر اسرار لذت اور مسرت کا جو کسی حسین شئے کو دیکھ کر ہمیں حاصل ہوتی ہے ۔ ارسطو تک پہنچتے پہنچتے جمالیات نے اپنے ارتقاء کی بہت سی منزلیں طئے کر لیں ۔ ارسطو فطرت ہی کو حسن کا سر چشمہ خیال کرتا ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ فن کی حظ سے مراد وہ حظ ہے جو ہمیں نقل میں اصل کو پہچان لینے سے حاصل ہوتا ہے ۔ حسن فطرت کائنات کا ایک جوہر ہے اور جب یہ اپنا اظہار محسوس اشیاء میں کرتا ہے تو ان میں جاذبیت اور دلکشی پیدا کر دیتا ہے اور وہ چیز ہمارے لیے جنت نگاہ بن جاتی ہے اور یہی چیز طرب و نشاط اور کیف و سرور کا باعث بھی بن جاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس بات کو جمال و جلال ، دلکشی اور جاذبیت کا نام دیا گیا ہے اس کو کیف و سرور اور حظ کہتے ہیں اور ان سب کے مجموعی تاثر کا نام وجدان ہے ۔

اردو میں جب ہم جمالیاتی تنقید کی تلاش کرتے ہیں تو ہمیں مختلف نقادوں کے یہاں ایسے رجحانات اور اشارے مل جاتے ہیں جو جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ ان نقادوں میں ایسے لوگوں کی تعداد کم ہی ہے جن کو مکاتیب نقد کے سلسلے میں مستقل طور پر کسی خاص دبستان نقد میں شامل کیا جائے ۔ اس لیے کہ ان کی تحریروں میں بیک وقت مختلف رجحانات کے تلاش کی گنجائش ہے ۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاص تنقید کے اسی دبستان فکر سے تعلق رکھتے ہیں ۔ جس میں ادب کو تاثرات کا فنی اظہار سمجھ کر اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کا ایک نمایاں وصف یہ بھی ہے کہ اس میں فنکار کے فنی محاسن کو بھی مد نظر رکھا جاتا ہے اور بعض وقت یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ تاثراتی تنقید میں شاعر یا ادیب سے زیادہ خود نقاد کی شخصیت نمایاں ہو رہی ہے ۔ جہاں تک ڈاکٹر یوسف خاں کے اسلوب تقید کا تعلق ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے فنکار اور اس کے فن کے محاسن ہی کو مد نظر رکھا ہے کہیں کہیں اس کی کمزوریوں اور خامیوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی ہے ۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے تنقیدی نظریات میں جو چیز بنیادی اہمیت کی ملتی ہے وہ تخلیق کا محرک ہونا، وجدان کا ہونا اور استدلالی رمزیت اور حسن بیان ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے تنقیدی رجحانات میں تاثراتی تنقید سے زیادہ تجزیاتی، تشریحی اور تقابلی تنقید کے اثرات ملتے ہیں۔ مثلاً حافظ اور اقبال میں انہوں نے اقبال اور حافظ کے تصورات حسن اور عشق کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی نظر میں ادب کا بنیادی مقصد ان ہی تہذیبی قدروں کی تخلیق اور پرورش ہے جن کی نوعیت آفاقی ہوتی ہے کیونکہ ان ہی سے زندگی میں حسن اور خیر کی برکتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس موضوع پر انہوں نے اپنے مضمون بہ عنوان "ادبی قدریں" میں تفصیلی بحث کی ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے ہی ہم ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی شخصیت میں جمالیاتی اور تاثراتی نقاد کا سراغ لگا سکتے ہیں۔

روحِ اقبال

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی اولین اور اہم ترین تصنیف "روح اقبال" ہے جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ء میں نکلا جس نے دنیائے ادب کو چونکہ دیا۔ اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ بیس ۲۰ سال کے عرصے میں اس کے چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں یعنی چھٹا ایڈیشن ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ یہ ایڈیشن ۴۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی مقبولیت کے اسباب میں ایک تو خود اقبال کی اپنی شخصیت اور ان کا کلام ہے جو ابتداء ہی سے ہندوستان بھر میں مقبولیت حاصل کر چکا تھا دوسرے یہ کہ "روح اقبال" میں یوسف صاحب نے صحیح انداز میں کلام اقبال کے مختلف پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ کیا اور صحت مند طریقے سے اقبال کے جذبات، افکار اور اس کے بیان کی ترجمانی کی ہے۔ اس کے چھپتے ہی مختلف اہل رائے نے اس کی تعریف کی۔ اس کی مقبولیت عام کا اندازہ صباح الدین عبدالرحمن کے اس بیان سے ہوتا ہے:

"غالب کو سمجھانے میں اولیت کا جو درجہ حالی کی "یادگار غالب" کو ہے وہی اقبال کو سمجھانے میں "روح اقبال" کا ہے۔(۱)

"روح اقبال" پر اب تک جتنی تنقیدیں لکھی گئی ہیں ان میں اکثر و بیشتر نقادوں نے ڈاکٹر صاحب کے نظریات سے اتفاق ہی کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انہیں اقبال سے جو والہانہ شغف تھا اس کے اثرات ہم کو "روح اقبال" کے ہر صفحہ میں پنہاں ملتے ہیں۔ جس کی تصدیق صباح الدین عبدالرحمن نے ان الفاظ میں کی ہے

ان کو اقبال سے عشق تھا اس لیے اس کے لکھنے میں
ان کے ہر صفحہ پر سرشارانہ کیفیت دکھائی دیتی ہے
شروع میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس کو پڑھ
کر اس کے ناظرین شائد یہ کہہ اٹھے ہوں گے کہ اس
کی ہر سطر ایک کرشمہ۔ حسن ہے جس کی طرف
دامن دل کھنچ کر رہ جاتا ہے۔"(۲)

یوسف صاحب کی تصنیف "روح اقبال" نے ہند و پاک کے تمام ارباب ذوق کو متاثر کیا چنانچہ "چٹان" کے ایڈیٹر شورش کاشمیری نے ان الفاظ میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس سے بہتر کتاب تو پاکستان میں بھی نہیں لکھی گئی"(۳)

"روح اقبال" کے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں یوسف صاحب نے جو تمہید اٹھائی ہے اس سے ان کے تنقیدی نظریات اور اقبال کے تعلق سے ان کے خیالات و تاثرات کا سراغ ملتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"کسی مفکر شاعر کے تصور حیات کو سمجھنا اور
دوسروں کو سمجھانا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ ظاہر ہے
کہ یہ بغیر تجزیئے کے ممکن نہیں۔ لیکن اگر تجزیہ
منطقی اور میکانکی اصول پر کیا جائے تو شعر پر اس
سے بڑھ کر اور کوئی ظلم نہیں ہو سکتا"۔(۴)

یہ جملہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نظریات نقد میں شعر کو پرکھنے کا پیمانہ محض منطقی اور میکانکی اصول پر مبنی نہیں ہے۔اس قسم کا رویہ ان کی نظر میں ایک ظلم ہے۔البتہ وہ جس پیمانے کے قائل ہیں اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہو سکتا ہے وہ لکھتے ہیں:

> " واقعہ یہ ہے کہ شعر جیسی لطیف چیز جس کی پرورش آغوش وجدان میں ہوتی ہے۔ منطقی تنقید و تجزیئے کی گرانباری کی متحمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ نقد و نظر کرنے والا اپنی فکر کو شعر کی طرح تخلیقی نہ بنالے وہ اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا"۔(۵)

ڈاکٹر صاحب صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ نقاد سے ان کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جب تک اس پر بھی کم و بیش اسی قسم کی قلبی واردات نہ گزر چکی ہو جس سے شاعر کو شعر کہتے وقت واسطہ پڑا تھا تو اس کی تنقید خلوص کی متحمل نہیں ہو سکتی۔اور ان کی نظر میں ادب عالیہ کی تخلیق ممکن نہیں۔اسی نظریاتی تنقیدی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ یہ بھی کہتے ہیں۔

> " میں اس ضمن میں شعر کہنے والے اور شعر سمجھنے والے دونوں کو شامل سمجھتا ہوں۔تنقید تخلیقی ہونی چاہیئے اس واسطے کہ اس کا مقصود و منتہا ان کیفیات کی باز آفرینی ہے جو شاعر پر گزری تھیں۔تجزیئے میں جب تک تخلیقی عنصر شامل نہ ہو نقد و نظر کا حق ادا نہیں ہو سکتا"۔(۶)

یہاں یہ ذکر بے جانہ ہوگا کہ شاعری کے بارے میں جو خیالات یوسف صاحب کے ہیں

اس کا سراغ ہمیں شبلی کی شعرالعجم میں ملتا ہے ۔ شاعری شبلی کے نزدیک ذوقی اور وجدانی چیز ہے ۔ ایرانی شعراء کی طرح شبلی احساس کو شاعری کا دوسرا نام بتاتے ہیں یعنی ان کے خیال میں احساس جب الفاظ کا جامہ پن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے اور یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے کیونکہ جب تک کسی واقعہ یا کسی کیفیت یا کسی منظر کو کوئی شخص محسوس نہ کرے تب تک وہ شعر کے سانچے میں کیسے ڈھل سکتا ہے ۔ شبلی کے نظریئے کے مطابق محاکات اور تخیل بھی شاعری کے اہم عناصر ہیں ۔ وہ تخیل کو قوت اختراع کا نام دیتے ہیں ۔(۷)

شعرالعجم میں جہاں جہاں تنقید ہے وہ شبلی کا تخلیقی عمل معلوم ہوتا ہے ۔ شعر کو پرکھنے کے لیے جو رویہ شبلی کا ہے وہی کم و بیش یوسف صاحب کا بھی ہے ۔

یوسف صاحب نے "روح اقبال" میں کلام اقبال کے تنقیدی جائزے کے مد نظر اس مطالعہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے ۔ ۱ ۔ آرٹ ۔ ۲ ۔ تمدن ۔ ۳ ۔ مذہب ۔ چونکہ ان تینوں شعبوں کے تحت زندگی اور کائنات کے تمام اہم مسائل آجاتے ہیں اس لیے "روح اقبال" کے تمامتر مباحث ان تینوں کا احاطہ کرتے ہیں لیکن ہر موضوع پر چند ذیلی عنوانات کے تحت تفصیلی بحث کی گئی ہے ۔

اقبال اور آرٹ کے تحت اقبال کی شخصیت ، آرٹ اور زندگی ، خلوص اور شعر ، شاعر اور عالم فطرت ، جذبہ عشق اور تسخیر فطرت ، عشق اور عقل ، اقبال کا شاعرانہ مسلک ، رومانی آرٹ ، تخیلی پیکر ، آرٹسٹ کے کیرکٹر ، فنی تجربہ ، شاعرانہ مصوری ، تشبیہیں ، اثر آفرینی ، اقبال کی غزل اور ترکیبوں کی جدت جیسے اہم مسائل سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے ۔

روح اقبال کا دوسرا جلی عنوان "اقبال کا فلسفہ ۔ تمدن" ہے ۔ اس کے توضیحی مطالعہ میں انھوں نے جن امور کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے ان میں خودی ، مقاصد آفرینی ، عمل اور اخلاق ، قصہ ۔ آدم ، انسانی فضیلت ، اجتماعی خودی ، تاریخی استقراء ،

انسان کامل، حیات اجتماعی، فرد اور جماعت، مملکت اور تمدن، نظام معیشت، نظام معاشرہ، اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبیعی تصورات، حیرت خانہ۔ عالم، خودی اور خدا، اور توحید جیسے ذیلی عنوانات ملتے ہیں۔

"روح اقبال" کا تیسرا اہم موضوع مذہب ہے۔ اس کے تحت انہوں نے کلام اقبال کا قرآنی احکامات اور دیگر اسلامی علوم کی روشنی میں تقدیر اور زمانہ۔ مسلئہ جبر و اختیار، معراج نبیؐ، خودی، عشق اور موت کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اقبال کے نظریۂ فن کا مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> "اقبال آرٹ کو زندگی کا خادم خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک حقیقی شاعر وہ ہے جو اپنی شخصیت کی قوت اور جوشِ عشق کی بدولت اپنے دل و دماغ پر ایسی کیفیت طاری کرے جس کے اظہار پر وہ مجبور ہو جائے یہی کیفیت آرٹ کی جان ہے" (۸)

اقبال کے نزدیک حسن اور صداقت ایک ہے۔ آرٹ کی اعلیٰ قدر و قیمت یہ ہے کہ وہ روحانی اور اخلاقی قدروں کا احساس توازن و ادراک حسن کے ذریعہ پیدا کرے۔ ان کے نزدیک حسن آئینہ حق ہے اور دل آئینہ حسن ہے جیسا کہ اپنی نظم "شکسپیئر" میں اس نے کہا ہے کہ ؎

حسن آئینہ حق اور دل آئینہ حسن
دل انسان کو ترا حسن کلام آئینہ (۹)

اقبال کی نظر میں سچا آرٹسٹ عاشق ہوتا ہے۔ اس کے پاس فنکار اہم ہے اور خلوص دل، پاک نظر اور ایمان کامل کے ساتھ کوئی فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کرے تو اسے دوام حاصل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اقبال کے نظریۂ فن سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اقبال نے جس چیز کو خون جگر کہا ہے وہ یہی
خلوص ہے جس کی پرورش جذبے کے آغوش میں
ہوئی ہے"۔(۱۰)

اس کی تصدیق اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" کے ان اشعار سے ہو سکتی ہے جس میں وضاحت کے ساتھ اقبال نے اپنے نظریۂ فن کو پیش کیا ہے۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود
قطرۂ خون جگر سل کو بناتا ہے دل
خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ اقبال کے نظریۂ فن میں حسن فطرت کا بھی اہم مقام ہے۔ وہ اپنے آرٹ کے ذریعے فطرت سے تعلق پیدا کرتا ہے اور نفس گرم سے اس میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ اس کی نظر میں فطرت کا وجود آرٹسٹ کا ممنون نظر ہوتا ہے۔ فطرت بے صورت ہوتی ہے آرٹسٹ اسے صورت عطا کرتا ہے۔ شاعر فطرت کی ہر ادا کا نکتہ دان ہے اور فطرت بھی اس کے مقاصد کا ایک وسیلہ ہے۔ اقبال نے ان خیالات کو مختلف نظموں میں مختلف پیرایوں میں پیش کیا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے کہ فطرت مجبور محض ہے۔ جس طرح آرٹ انسانی ذہن کا کارنامہ اور حقیقت کا بالراست ادراک ہے اسی طرح فطرت ذات باری کا کارنامہ ہے کیونکہ فطرت کا خالق خدا ہے اور آرٹ کا خالق انسان ہے۔ فطرت اور آرٹ کی اس بحث میں تو یونانیوں کی نگاہیں اصل اور نقل کے وسائل میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ وہ انسانی کارناموں کو اصل کی نقل سے زیادہ اہمیت دینے کے قائل نہیں تھے لیکن بعد کے

نقادوں نے فنکار کے حسن تخلیق اور سلیقہ اظہار کو بھی اصل کا ہم رتبہ جانا ہے۔
اقبال بھی اسی نظریئے کے قائل ہیں۔ان کا خیال ہے کہ آرٹ کے ذریعہ انسانی ذہن
ایسے تصور اور خیالی نقشے بناتا ہے جو فطرت سے ہم آہنگ ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات
تو فطرت کی کوتاہیوں کی تکمیل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔یہ نظریہ ہم کو اقبال کی
ایک مشہور فارسی نظم "محاورہ مابین انسان و خدا" میں وضاحت کے ساتھ ملتا ہے۔

اقبال کے نظریہ فن میں جذبہ عشق اور تسخیر فطرت کا عنصر بھی اہمیت رکھتا ہے
لفظ عشق کو اقبال نے نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔عشق سے اقبال کی
مراد وہ جوش وجدان ہے جو ایک قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔جس کے تانے بانے سے
ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے۔اسی کی بدولت انسان تکمیل ذات کے لیے جذب و
تسخیر پر عمل پیرا ہوا ہے۔یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جس کا خاصہ مستی، انہماک اور
جذبہ کلی ہے۔اقبال عشق سے فطرت کی تسخیر کا کام لینے کا پیام دیتا ہے۔اس کی نظر میں
عشق ہی زندگی کا سب سے بڑا محرک ہے۔ عشق ہی سے زندگی کے امکانات اجاگر
ہوتے ہیں اور اس کی محدودیت بے کرانی میں بدل جاتی ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے عشق اور عقل کی بحث کا جائزہ بھی اقبال اور
آرٹ کے عنوان کے تحت ہی لیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ اقبال عشق کو عقل کے مقابلے
میں فضیلت دیتا ہے۔اس واسطے کہ اس سے حقائق اشیا کا مکمل علم اور بصیرت حاصل
ہوتی ہے۔اقبال کے نزدیک عقل کا کام یہ ہے کہ وہ مادی اور امکانی دنیا کے معاملوں
کو سلجھائے اور ان کے مخفی پہلوؤں کی عقدہ کشائی کرے۔ان کی نظر میں اقبال عقل
کو بھی زندگی کے خادموں میں شمار کرتا ہے اور عقل کے تعلق سے اقبال کا نظریہ یہ
ہے کہ علم و عقل انسان کو منزل کے قریب تو پہنچا سکتے ہیں لیکن بغیر عشق کی مدد کے
منزل کو طے نہیں کرا سکتے۔اس لیے اقبال کے نزدیک عقل کی سب سے بڑی کمزوری
یہ ہے کہ اس میں جرات رندانہ کی کمی ہے(۱۱)

آل احمد سرور کے حسب ذیل بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے:

"روح اقبال" میں اس عشق کی وضاحت اچھی طرح
کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ عشق لازمی
طور پر عقل کی ضد نہیں ہے بلکہ یہ عقل محض سے
ارفع ہے اور جہاں عقل نہیں پہنچ سکتی عشق کا گزر
ہو جاتا ہے"۔(۱۲)

یوسف صاحب جذبہ عشق کے تعلق سے قدما کے نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ افلاطون نے اپنے مکالمات میں اور بعد میں ابن سینا نے بھی عشق کی حقیقت کے متعلق بڑی دقیقہ سنجی سے بحثیں کی ہیں۔قدما کے خیال میں عشق وہ قوت ہے جو عالم کون و فساد میں ربط قائم کرتی ہے۔اقبال نے بھی اسی خیال کو نہایت لطیف انداز میں اپنی نظم "محبت" میں بیان کیا ہے(۱۳)

ڈاکٹر صاحب نے اقبال کے شاعرانہ مسلک سے بھی تفصیلی بحث کی ہے اور اس بحث کے دوران کلام اقبال کا فنی تجزیہ، تخلیقی پیکر، شاعرانہ مصوری اور اثر آفرینی جیسے مباحث پر بھی وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

اقبال کا تخیل بھی قوت ارادی کے عمل سے خالی نہیں اس نے جذبہ اور تخیل دونوں کو ارادہ کی قوت، قوت محرکہ سے جمالیاتی قدر عطا کی ہے۔

یوسف صاحب اقبال کے طرز ادا کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اقبال کے طرز ادا میں آزادی، مستی اور جذب
ایسے ملے ہوئے ہیں کہ انسان اس کے کلام کو سن
کر وجد کرنے لگتا ہے۔وہ اپنی شخصیت کا اظہار لفظ
"قلندر" سے کرتا ہے"(۱۴)

اقبال کا یہی قلندر اس کے اشعار میں مرد مومن کہلاتا ہے جس کی ذات میں

آفاق گم ہے ۔یہی مومن فخر روزگار اور کائنات کا حاکم بھی ہے اور کائنات سے ماورا بھی
اقبال کی شاعرانہ مصوری کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اقبال کو ادبی مصوری
میں بھی کمال حاصل ہے ۔اس کی شاعرانہ مصوری کے نہایت عمدہ نمونے بیشتر
نظموں میں ملتے ہیں ۔مثال کے طور پر ان کی نظم "ایک آرزو" اور " ۔خضر
راہ کے کافی اشعار" ساقی نامہ " کے ابتدائی بند اور نظم " محبت " وغیرہ قابل ذکر ہیں
(۱۵)

اقبال کو منظر کشی میں کمال حاصل ہے ۔وہ لفظوں کے طلسم سے فطرت کی
تصویر کھینچ دیتا ہے ۔الفاظ کے انتخاب کے ساتھ اقبال کی اچھوتی اور نادر تشبیہیں بھی
اس کے کلام کے حسن اور تاثیر کو کئی گنا بڑھا دیتی ہیں ۔وہ کلام اقبال کے اسی پہلو کا
تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اقبال تشبیہوں کا بادشاہ ہے اور تشبیہ حسن کلام کا
زیور ہے ۔اقبال مضمون کی طرفگی اور حسن کو اپنی تشبیہوں سے دوبالا کر دیتا ہے ۔
(۱۶)

اقبال نے جس زمانے میں مثنوی " اسرار خودی " لکھی تھی اس وقت
ہندوستان میں مشکل ہی سے اس کے چند ہم نوا تھے ۔لیکن جب اقبال کی یہ مثنوی شائع
ہوئی تو اس مثنوی کو اقبال کے زور کلام اور اثر آفرینی کا اعلیٰ ترین نمونہ سمجھا گیا ۔اسی
طرح اقبال کی نظم " فاطمہ بنت عبداللہ " بھی تاثیر سے لبریز نظم ہے ۔یوسف صاحب
اس نظم کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس نظم کا موضوع بجائے
خود دل پر اثر ڈالنے والا ہے (۱۷)

کتاب کے اس باب میں یوسف صاحب نے اقبال کی غزل کا بھی تنقیدی جائزہ
لیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے رنگ تغزل میں بھی اس کا نظریہ آرٹ کار فرما ملتا ہے
یعنی کہ جمالی اور جلالی دونوں عنصر پہلو بہ پہلو موجود ہیں ۔اقبال کی غزل میں چاہے وہ
عشق و محبت کی معاملہ بندی ہی کیوں نہ ہو ایک طرح کی قوت و تازگی کا اظہار ملتا ہے

معانی کے علاوہ محاسن کلام کے ظاہری انداز بھی لفظی رعایتوں کو برتنے پر بھی اسے پوری قدرت حاصل ہے۔اس کے یہاں شاعرانہ رمزنگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں (۱۸)

اقبال کی غزل کی خصوصیت اس کا جوش بیان اور رمزیت ہے۔اس کے الفاظ میں بلا کی لسانی قوت پوشیدہ ہے۔وہ حسن ادا کے جادو سے انسانی ذہن کو مسحور کر دیتا ہے۔ اقبال ایسی بحریں اور زمین منتخب کرتا ہے جس سے غزلوں میں ایک غنائیت پیدا ہوتی ہے۔یہ وصف اس کی اردو اور فارسی دونوں غزلوں میں پایا جاتا ہے۔اس کی بعض اردو غزلیں سہل ممتنع کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔الفاظ اور معانی کی موزونیت کے علاوہ بھی اقبال کی غزل اپنے بلند مضامین کے اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔

یوسف صاحب کلام اقبال کی فنی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں اقبال کے آرٹ اور زندگی کے تصور میں توانائی کے مظہر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کا اعلیٰ ترین اظہار قوت کی شکل میں ہوتا ہے۔اقبال کے تخلیقی محرکات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان میں اس قدر تنوع ہے کہ ان کا نفسیاتی تجزیہ ممکن نہیں وہ لکھتے ہیں:

> "میرا خیال ہے کہ اقبال کے وجدان اور جذبات شعری کو جو چیز سب سے زیادہ متحرک کرتی ہے وہ یہی جوش حیات ہے جو اسے عالم انسانی اور عالم فطرت دونوں میں نظر آتا ہے۔قوت میں اسے حسن نظر آتا ہے"۔(۱۹)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے کلام اقبال کے تجزیاتی مطالعے میں جو دوسرا اہم مقدمہ قائم کیا ہے وہ اس کا فلسفۂ تمدن ہے۔یہ عنوان اس سے پہلے کسی اور ناقد کے

زیر فکر نہیں رہا۔ انہوں نے اس طویل باب میں اقبال کے فلسفہ تمدن کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کے پاس فلسفے کا ماخذ اسلامی روایات ہیں۔ جن میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نہایت خوبی سے سمویا گیا ہے اور ان کے ظاہری تضاد کو رفع کر دیا گیا ہے۔ اسلامی تمدن کو دنیا کے دوسرے تمدنوں کے مقابلے میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے انسانی فطرت کو مد نظر رکھتے ہوئے عدل و اعتدال کا دامن اپنے ہاتھ سے کبھی نہ چھوڑا اس تمدنی نظام میں فرد کی اہمیت کے حدود اجتماعی معاشرے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مقرر کیے گئے ہیں۔ اسلامی تمدن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کا حامی ہے جس میں فرد کی اساسی خودی اور عزت نفس پامال نہ ہونے پائے اور نہ ہی فرد اس معاشرے میں راہ حیات کا اکیلا راہ رو ہو سکتا ہے۔ فرد کو معاشرے کا پابند بنایا گیا ہے ان کی نظر میں اقبال کے فلسفہ تمدن کے عناصر ترکیبی میں خودی کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ زندگی کا اصل محرک اثبات خودی کا جذبہ ہے جو انسان میں ودیعت کیا گیا ہے۔ خودی، زندگی کو مسلسل حرکت اور نت نئی خواہشوں کی تخلیق کا پابند رکھتی ہے۔(۲۰)

اقبال کا فلسفہ خودی جہاں ایک طرف عشق سے فروغ پاتا ہے وہیں زندگی کے کارزار میں سرگرم عمل رہنے کے سبب بقا سے بھی ہم آہنگی رکھتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کوئی چھبیس ۲۶ صفحوں تک خودی کے فلسفے سے تفصیلی بحث کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کا تصور عشق اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے اور اسلام جس مخصوص تمدنی نظام کی تسکین چاہتا ہے وہ خودی کے بغیر مستحکم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اقبال خودی کی توسیع و بقا کو اپنے فلسفہ تمدن کا سنگ بنیاد قرار دیتا ہے۔ اقبال کے تصور خودی کا خلاصہ ہم کو "ساقی نامہ" کے ان آخری بندوں میں ملتا ہے جس میں خود اقبال نے خودی کے عناصر ترکیبی، خودی کے

تقاضوں، خودی کے محرکات اور خودی کے مقامات سے بنی نوع انسان کو آگہی بخشی ہے۔(۲۱)

ڈاکٹر صاحب کے تجزیاتی مطالعہ پر پروفیسر احتشام حسین کا حسب ذیل تبصرہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے ملاحظہ ہو:

"اقبال کے یہاں خودی زندگی کا مرکز ہے اگر وہ واضح نہیں تو کچھ بھی واضح نہیں۔ "روح اقبال" میں یہی ملتا ہے کہ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے جو نت نئی خواہشات کی تخلیق کرتی اور اسی طرح اپنی توسیع و بقا کا سامان مہیا کرتی ہے۔ وہ پیہم عمل اور کشمکش سے لازوال ہو جاتی ہے"۔(۲۲)

پروفیسر سید احتشام حسین اقبال کے ان افکار کو ایسے تصوراتی افکار تسلیم کرتے ہیں جن کا کہیں بھی عملی تجربہ مشاہدہ میں نہیں آسکا وہ یہ جواب طلب کرتے ہیں:

"یہ پیہم عمل اور کشمکش کس کے خلاف ہو اقبال تو ہیگل کے صدف کو گہر سے خالی کہتا ہے اس کی کشمکش خلا میں نہیں ہونی چاہئے۔ کشمکش اور عمل سماجی رشتہ میں زندگی کی قدریں پیدا کرتے ہیں۔ ترقی کے راستے دکھاتے ہیں۔ اپنی ہی ذات سے، اپنے ہی اندر کی کشمکش تصوف کی راہ پر ڈال دیتی ہے، اقبال کے اشارے انسانوں کی مدد کم کر سکتے ہیں۔ پانی کا قطرہ جب حرف خودی ازبر کر لیتا ہے تو اپنی ہستی۔ی بے مایہ کو گہر بنا دیتا ہے، سبزہ جب

اپنی ذات میں لگنے کی قوت پیدا کرلیتا ہے تو سینہ ۔
گلشن کو چاک کر ڈالتا ہے کوئلہ ہیرا بنتا ہے اور نہ
جانے کیا کیا ہو جاتا ہے"۔(۲۳)

گویا پروفیسر سید احتشام حسین کی نظر میں یہ ایسی مثالیں ہیں جو انسانوں کی رہنمائی نہیں کر سکتیں کیونکہ ان کے تجربوں کی زبان بالکل دوسری ہے ۔ان کی کشمکش اور ان کا عمل پانی کے قطرے، کوئلہ اور سبزے کی کشمکش سے بالکل جداگانہ ہے اور خالص منطقی حیثیت سے بھی یہ مثالیں صرف شاعرانہ تشبیہیں ہو کر رہ جاتی ہیں ۔اقبال اس مسئلہ میں بھی تصور محض سے کام لیتا ہے اور اس کشمکش کو شعور کی کشمکش اور اپنے وجود کی کشمکش میں محدود کرتا ہے ۔(۲۴)

پروفیسر سید احتشام حسین نے خودی کے عملی مظاہر کے امکانات پر جن شک و شبہات کا اظہار کیا ہے اور یہ اعتراض کیا ہے کہ جب تک خودی کی مختلف کیفیتیں اور حالتیں جن کا ذکر جا بجا اقبال کے کلام میں ملتا ہے خالص منطقی حیثیت سے قابل عمل اور قابل قبول نہ بن جائیں تب تک یہ محض شاعرانہ تشبیہیں ہی تصور ہوں گی حالانکہ ایسا نہیں ۔

یوسف صاحب نے اقبال کے تصور خودی اور اس کے عوامل کا اسلامی نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے ۔اسلامی اقدار میں بنیادی اہمیت نیکی کو حاصل ہے چنانچہ وہ اپنے تجزیہ میں اس بحث کو اسی طرح آگے بڑھاتے ہیں کہ نیکی کوئی بنی بنائی چیز نہیں بلکہ وہ برابر ہمارے عمل سے بنتی رہتی ہے ۔ عمل انسانی زندگی کا پھولنا پھلنا ہے اس کے ذریعے زندگی اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کا اعلیٰ ترین اظہار کرتی ہے ۔اقبال کے مافی الضمیر کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عمل، خودی اور زندگی کا اصل سرچشمہ ہے ۔ تعقل اور تصور اس کے بہت بعد پیدا ہوئے ۔وہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ خود انسانیت علم سے حقیقت سمجھی جاتی ہے اور عمل سے اس میں تبدیلی اور تصرف ممکن ہوتا ہے ۔

ہر وہ انسان جو اپنی تکمیل کی راہ طے کر رہا ہو اس میں اخلاقی توانائی کا ہونا ضروری ہے جو عمل کی محرک ہوتی ہے۔ نیک عمل ہر قسم کے ماحول پر قابو پا سکتا ہے۔ زمانے کے عمل و مرور سے تبدیلیاں یقیناً ہوتی ہیں لیکن قدریں اپنا روپ بدل کر بعد میں بھی کسی نہ کسی شکل میں قائم رہتی ہیں۔ اخلاقی شعور میں انسان کی آزادی کی تکمیل ہوتی ہے اور اخلاقی قانون اس کے وجود کا قانون بن جاتا ہے۔ انسانی عزائم کی تہہ کو ٹٹولیے تو ان کے ڈانڈے ہمیشہ جذبات سے ملتے نظر آئیں گے جو افراد اور جماعتوں کو تخلیقی مقاصد پر اکساتے ہیں۔ عقل کا کام یہی ہے کہ وہ نت نئے بت بناتی ہے اس لیے اقبال عقل کو زناری اور عشق کو مسلمان کہتا ہے۔ جذبے سے انسانی ذہن عالم محسوس کے پرے جاسکتا ہے اور ان حقائق کا پتہ چلاتا ہے جو عقلی استدلال کی گرفت سے بالاتر ہوتے ہیں۔ قدروں کی تخلیق میں بھی جذبے کی کار فرمائی موجود ہوتی ہے۔ (۲۵)

اقبال حیات انسانی کے ارتقا اور اس کی تکمیل کے لیے خودی کو لازمی قرار دیتا ہے اور خودی کے فروغ کے لیے انسانیت کے اعلیٰ اقدار کی نگہداشت کو لازمی گردانتا ہے اور اقدار کی نگہداشت کا مقصد پیغام الہیٰ سے وابستہ ہوتا ہے لہذا اقبال کے فلسفہ خودی کے ساتھ وہی لوگ انصاف کر سکتے ہیں جن کے افکار میں اسلامی آئین و قوانین اساسی اہمیت رکھتے ہوں اور اسلامی روح سے وہ پوری طرح آگہی رکھتے ہوں وہی لوگ قطرے کے گہر بننے اور کوئلے کے ہیرا بننے کے عملی تجربے کو بھی یقینی سمجھتے ہیں۔

اقبال کے فلسفہ تمدن میں قصہ۔ آدم کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ تمام آسمانی کتابیں اور تمام اقوام عالم کی تاریخیں اس قصہ آدم سے معمور ہیں۔ عمرانی تاریخ چاہے کتنی صدیوں کا فاصلہ طے کر لے لیکن تخلیق آدم کا قصہ ہمیشہ تازہ ہی رہے گا اور اس کے ساتھ ساتھ فضیلت آدم، احترام آدم، حرمت انسانیت اور عزت نفس وغیرہ جیسے موضوعات پر انسان کو ہمیشہ سوچنا پڑے گا کیونکہ ان جوابات کی روشنی میں

انسانی معاشرہ فروغ پاسکتا ہے اور ایک صحت مند معاشرہ ہی ایک مہذب تمدن کا آفریدہ گار بن سکتا ہے۔اس پورے باب میں یوسف صاحب نے فلسفۂ تمدن سے جو بحث کی ہے اس میں سماجی، تاریخی، سیاسی، عمرانی، معاشی اور معاشرتی عوامل اور پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور ہر جائزے میں انہیں اقبال کے افکار کی تشریحات و توضیحات میں قرآنی احکامات کو ملحوظ رکھنا پڑا ہے۔اس تنقیدی جائزے میں وہ ایک اعتدال پسند نقاد کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

روح اقبال کا آخری مگر اہم باب مذہب ہے۔مذہب کلام اقبال کی روح ہے۔ اگر اقبال کے کلام سے مذہب کو نکال دیا جائے تو یقیناً وہ بے جان اور بے روح کلام کہلائے گا۔مذہب جو انسان کے لیے خونِ رگِ حیات ہے اس کا تفصیلی جائزہ لینا بھی ضروری تھا۔اقبال نہ صرف مذہب اسلام پر بلکہ مذاہب عالم پر ایک عالمانہ نظر رکھتے تھے۔اس لیے ان کے یہاں اعلیٰ درجے کی مذہبی بصیرت بھی حیرت ناک حد تک موجود ہے۔انہوں نے مذہب کو وسیع معنی و مفہوم میں برتا ہے اور اس لیے اقوام عالم کے مختلف مذاہب کا، ان کے علماء کا، پیغمبروں کا اور ان کے آسمانی صحائف کا وہ دل سے احترام کرتے ہیں۔انہوں نے اپنی مثنوی "جاوید نامہ" میں مشاہیر عالم کا۔ جن میں مذہبی پیشوا بھی ہیں، علما بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں، رہنما بھی ہیں اور مصلح بھی ہیں۔ بلا امتیاز مذہب و ملت رنگ و نسل تمثیلی انداز میں ان شخصیتوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے تو محض اس لیے کہ وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے محافظ رہے ہیں اور انسانیت کے بلند ترین مقامات پر فائز ہیں۔ اقبال کے مذہبی عقائد میں حیات مابعد الطبیعات کا فلسفہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا ایقان ہے کہ یہ عقیدہ انسان کی ہستی کی تکمیل کرتا ہے۔اگر انسان سے یہ ایقان چھین لیا جائے کہ اس عالم کے سوا ایک اور عالم بھی ہے جہاں اس کو ابدی زندگی گزارنا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انسان کو نہ تو شر سے بچا سکتی ہے اور نہ نفس کے فتنوں سے اسے محفوظ رکھ سکتی ہے

اور نہ کوئی طاقت اس کو بے محابہ ہونے سے روک سکتی ہے ۔اس پورے باب میں ڈاکٹر صاحب نے کلام اقبال کے حوالے سے تفصیل کے ساتھ ان پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے کہ اقبال کے نزدیک مذہب کا مفہوم کیا ہے؟ مابعد الطبیع تصورات کی اہمیت کیا ہے؟ حیات انسانی کی تشکیل میں عقیدہ توحید کا کیا رول ہے؟ ایمان بالغیب کی اہمیت کیا ہے؟ انسان کو قدرت کی طرف سے کس حد تک مختار بنایا گیا ہے اور کس حد تک وہ مجبور ہے۔

" آل احمد سرور نے " روح اقبال " میں اقبال کی شاعری کے موضوعات کے بارے میں اپنی رائے یوں پیش کی ہے:

> " اس کتاب میں " تقدیر " کی بڑی اچھی توضیح کی گئی ہے ۔ آخر میں بقا اور موت پر بھی نہایت سلجھے ہوئے انداز میں تبصرہ ہے ۔اس طرح اقبال کے تمام بڑے موضوع فکر آگئے ہیں ۔(۲۶)

جبر و اختیار کے مسائل میں تقدیر کے مسئلے سے تفصیلی بحث کی گئی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان مجبور محض نہیں ہے بلکہ اسے قدرت کی طرف سے خیر و شر کے اختیار کرنے میں ایک حد تک آزاد اور خود مختار بنایا گیا ہے ۔یہ اختیار اس کی خودی کے تابع ہوتا ہے ۔خودی اس کے اختیار کے رہوار کو جس طرف چاہے موڑ سکتی ہے لگام دے سکتی ہے قابو میں رکھ سکتی ہے یا پھر ضرورت پڑنے پر مہمیز بھی لگا سکتی ہے ۔

انسان کے منصب و مقام کو سمجھانے کے لیے جہاں ایک طرف وحی الہیٰ کا نزول ہوتا رہا ہے وہیں اس کے ساتھ ساتھ صاحب وحی معجزات نبوت سے بھی سرفراز کیے جاتے ہیں ۔ان بیشمار معجزوں میں ایک اہم معجزہ ہمارے نبیؐ خاتم المرسلین کو معراج کا عطا ہوا تھا ۔معراج کے واقعہ میں حیات انسانی کے بہت سے سربستہ راز

پوشیدہ ہیں ۔ معراج کا واقعہ اقبال کی نظم میں دراصل زماں و مکاں کی گتھی کا حل اور فطرت کے مقابلے میں نفس انسانی کی آزادی کا موثر ادعا ہے جو پیغمبر اسلام نے اپنی وجدانی قوت سے دنیا کے سامنے پیش فرمایا۔

یوسف صاحب واقعہ معراج کے تجزیاتی مطالعہ میں لکھتے ہیں کہ علم کی قوت سے انسانی ذہن عالم کے پرے جاسکتا ہے اور اس پر تصرف حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ علم، علم حقیقی ہو۔ محسوس "زماں و مکاں" کی معروضی تحدید سے روح آزاد ہونا چاہتی ہے۔انسان کامل اپنے علم کی قوت سے جہان چار سو پر متصرف ہوجاتا ہے۔ (۲۷)

انسان مرسکتا ہے لیکن اس کا جذبہ عشق اس کو ابدی زندگی عطا کرتا ہے ۔ یوسف صاحب اس پہلو سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ماہرین نفسیات اس پر متفق نہیں ہیں کہ شعور کا تعلق صرفِ دماغ سے ہے۔برقی رو کی توانائی (انرجی) بظاہر موصل (کنڈکٹر) میں ہوتی ہے۔لیکن فی الحقیقت اس میں نہیں ہوتی بلکہ چاروں طرف کی فضاء میں ہوتی ہے۔اسی طرح روح کا وجود و بقا جسم سے کلیتہ وابستہ نہیں ہوسکتا۔ وہ اقبال کے ان اشعار سے ہی دلیل فراہم کرتے ہیں

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے (۲۸)

"روح اقبال" کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ یوسف صاحب نے اقبال فہمی کا ایک نیا راستہ دکھایا ہے۔وہ اقبال کی تنقیص نہیں کرتے بلکہ تفسیر کے قائل ہیں ۔ شائد اسی وجہ سے پروفیسر سید احتشام حسین نے اس رویہ کو تنقید کی کمزوری قرار دیا ہے۔اس لیے اس اعتراف کے باوجود کہ اقبال پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں "روح اقبال" سب سے بہتر کتاب ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں:

"اب تک لکھنے والے صرف اقبال کی تشریح و تفسیر
کرتے رہے ہیں اور کسی نے نقد کی جانب قدم
نہیں اٹھایا ہے۔(۲۹)

سید احتشام حسین صاحب اپنی تنقید نگاری کے پیمانے پر اسے پورا اترتا نہیں
پاتے اس کے باوجود اس اقرار پر مجبور ہیں۔

"جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے محدود یک طرفہ
تبصرہ ہونے کے باوجود اب تک اقبال پر سب سے
اچھی کتاب ہے"۔(۳۰)

آل احمد سرور نے بھی اپنی تنقید نگاری کی کسوٹی پر "روح اقبال" کو پرکھا ہے
انہوں نے اقبال کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی تنقید کو سراہا ہے
وہ لکھتے ہیں:

"بحیثیت مجموعی اس کتاب میں نہایت سنجیدگی اور
قابلیت سے تنقید کی گئی ہے۔انداز بیان واضح اور
دلکش ہے، جا بجا ضمنی مباحث پر بڑے مفید نوٹ
اور حاشیے ہیں۔مثلاً ادب برائے ادب، اشاریت یا
رمزیت کے متعلق اس کتاب کے مطالعے سے یہ
خیال اور بھی پختہ ہوتا ہے کہ اقبال اپنے زمانے کی
سطح سے کتنے بلند تھے۔(۳۱)

ان شہادتوں کی روشنی میں یوسف صاحب کا شمار تاثراتی نقادوں میں کر سکتے
ہیں اور ان کی تنقید کو ہم تاثراتی یا تجزیاتی تنقید کہہ سکتے ہیں۔انہیں یہ امتیاز بھی
حاصل ہے کہ انہوں نے اقبال کو پہلی دفعہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

حوالے

---

(۱) صباح الدین عبد الرحمن ۔ بزم رفتگان ۔(۲) صفحہ نمبر ۲۵۷۔

(۲) صباح الدین عبد الرحمن ۔ بزم رفتگان ۔(۲) صفحہ نمبر ۲۵۶۔

(۳) صباح الدین عبد الرحمن ۔ بزم رفتگان ۔(۲) صفحہ نمبر ۲۵۶۔

(۴) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ صفحہ نمبر ۷۔

(۵) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ صفحہ نمبر ۷۔

(۶) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ صفحہ نمبر ۸۔

(۷) شبلی نعمانی ۔ شعرالعجم ۔ ماخوذ حصہ اول ۔ صفحہ ۶ ۔ ۷۔

(۸) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ صفحہ ۸ ۔ ۱۵

(۹) اقبال ۔ بانگ درا حصہ سوم ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۲۷۷۔

(۱۰) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ صفحہ نمبر ۲۶۔

(۱۱) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ ماخوذ صفحہ ۲۶ تا ۴۹۔

(۱۲) آلِ احمد سرور ۔ نئے اور پرانے چراغ ۔ صفحہ نمبر ۳۱۲۔

(۱۳) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۵۶

(۱۴) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ صفحہ نمبر ۱۷۔

(۱۵) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ ماخوذ صفحہ ۹۵۔

(۱۶) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ رور اقبال ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۹۷۔

(۱۷) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۱۰۲۔

(۱۸) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۹۸۔

(۱۹) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ صفحہ نمبر ۱۱۳۔

(۲۰) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۱۲۰۔

(۲۱) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۱۲۶۔

(۲۲) سید احتشام حسین ۔ روح اقبال ۔ (ایک تبصرہ) رسالہ جامعہ ۱۹۴۰۔ صفحہ ۱۷۔

(۲۳) سید احتشام حسین ۔ روح اقبال ۔ (ایک تبصرہ) رسالہ جامعہ ۱۹۴۰۔ صفحہ ۱۷۔

(۲۴) سید احتشام حسین ۔ روح اقبال ۔ (ایک تبصرہ) رسالہ جامعہ ۱۹۴۰۔ صفحہ ۱۸۔

(۲۵) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۱۵۲۔

(۲۶) آلِ احمد سرور ۔ نئے اور پرانے چراغ ۔ صفحہ نمبر ۲۶۲۔

(۲۷) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۳۹۷۔

(۲۸) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۴۲۰۔

(۲۹) سید احتشام حسین ۔ روح اقبال ۔ (ایک تبصرہ) رسالہ جامعہ ۱۹۴۰۔ صفحہ ۱۰۔

(۳۰) سید احتشام حسین ۔ روح اقبال ۔ (ایک تبصرہ) رسالہ جامعہ ۱۹۴۰۔ صفحہ ۲۱۔

(۳۱) آلِ احمد سرور ۔ نئے اور پرانے چراغ ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۲۶۲۔

اردو غزل

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تنقیدی نگارشات میں "اردو غزل" ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ "روح اقبال" کی اشاعت کے فوراً بعد ہی ان کی جولانی طبع نے ایک اور وسیع میدان کو اپنایا۔ یہ وسیع میدان "اردو غزل" کا تھا۔ جو ان کے فطری میلانات اور رجحانات سے ہم آہنگ بھی تھا۔ اس کی اشاعت ۱۹۴۹ء میں عمل میں آئی۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں قریب قریب ایک ہی دہے میں اردو کے مختلف مکاتیب نقد و نظر کے ادیبوں نے اردو غزل کو اپنا موضوع بنایا اور مختلف زاویہ نظر سے اس صنف شعر کی داخلی کیفیتوں اور تقاضوں، غزل کی خارجی ساخت اور اسلوب، مواد اور موضوع سے بحث کی ہے۔ اس میں بعض مطبوعہ اور بعض غیر مطبوعہ تصانیف ہیں۔ مطبوعہ کتابوں میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب "اردو غزل" جو ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی اور دوسری ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تصنیف "غزل اور مطالعہ غزل" ہے جس کی اشاعت ۱۹۵۵ء میں عمل میں آئی ان تصانیف میں غزل کے لفظی و معنوی خوبیوں سے بحث کی گئی ہے اور

مختلف شعراء کے کلام کے انتخاب پر زیادہ توجہ دی گئی۔ان مطبوعہ تصانیف سے بھی پہلے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۸ء میں دو اہم مقالے جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کے تحت لکھے گئے یہ دونوں مقالے اس دور کے طالب علم اور بعد کے محقق اور بعد کے اساتذہ کے لکھے ہوئے ہیں جن میں ایک ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب کی تصنیف ہے جس کا موضوع "اردو غزل کا ارتقاء" ہے۔دوسرا مقالہ ڈاکٹر زینت ساجدہ کا "اردو غزل" کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔اگر چہ ان دونوں مقالوں میں موضوع بحث اور اس کے دائرہ تحقیق کا فرق ہے مگر اردو غزل کے بعض مضامین جیسے آغاز و ارتقاء، صنف غزل کا منصب و مقام، موضوعات اور محرکات، غزل کی تہذیبی روایات، فنی تقاضوں، غزل کے پیمانوں، مختلف سیاسی اور ادبی تحریکوں سے غزل کا تال میل غرض یہ کہ ایسے بیسیوں موضوعات کا تجزیہ و تشریح موجود ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی "اردو غزل اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کی "غزل اور مطالعہ غزل" ان دونوں کا مطالعہ ایک ساتھ کیا جائے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ دونوں کتابوں میں غزل کے تعلق سے نظریات اور موضوعات میں بڑی ہم آہنگی ملتی ہے۔ہمیں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب "اردو غزل" کا پلہ کہیں بھاری نظر آتا ہے کہ ایک تو اس تصنیف کو تاریخی تقدم حاصل ہے دوسرے عبادت بریلوی کے مقابلے میں یوسف صاحب بڑے قد آور نقاد اور ہمہ جہتی شخصیت کے مالک ادیب ہیں۔اس لئے لازمی طور پر عبادت بریلوی سے مقابلہ نامناسب ہوگا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عبادت بریلوی نے پانچ چھ سال بعد جو کتاب لکھی اس میں یقیناً یوسف صاحب کی کتاب سے اکتساب فیض کیا ہے۔یوسف صاحب کو صنف غزل سے والہانہ شغف اور فارسی شاعری سے گہرا تعلق خاطر رہا ہے اسی لئے وہ اردو غزل کے اچھے نباض ثابت ہوئے۔ چنانچہ اس کتاب میں انہوں نے پوری قوت اور جوش کے ساتھ اردو غزل کی وکالت کی ہے جسے ہم شبلی کے قول میں تصرف کرتے ہوئے غزل کی "مدلل مداحی" بھی کہہ سکتے

ہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تصنیف "اردو غزل" کے بارے میں ڈاکٹر عبدالمغنی نے اپنی رائے یوں ظاہر کی ہے۔

> "اس کتاب میں مصنف کی فنی معلومات اور علمی اطلاعات نے غزل گوئی اور تنقید غزل دونوں کے لئے بصیرت افروز حقائق کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا ہے
>
> (۱)

اردو غزل کے تنقیدی جائزے میں ان کی تاثراتی تنقید کا رنگ کھل کر سامنے آتا ہے۔ قدم قدم پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شبلی کی "شعرالعجم" کی راہ پر چل رہے ہیں یعنی جس طریقہ کار اور طرز انتقاد کو شبلی نے "شعرالعجم" میں اپنایا ہے قریب قریب وہی رنگ ہم کو "اردو غزل" میں ملتا ہے۔

اردو غزل اگرچہ سات سو چھتیس صفحات پر مشتمل ہے لیکن اس میں اردو غزل کا تنقیدی جائزہ (۳۹۵) صفحات پر مشتمل ہے اور باقی کے صفحات تمام تر انتخاب غزلیات کی نذر ہوگئے ہیں۔ تنقیدی حصہ کوئی (۲۹) موضوعات کی بحث پر مشتمل ہے۔ اس ضخیم مباحثہ میں غزل کی لغوی تعریف، عروض و بلاغت، فنی ہئیت کے مسائل، غزل کی خارجی اور ساختیاتی تنقید وغیرہ جیسے مباحث سے کوئی سروکار نہیں رکھا گیا ہے اس کتاب کی ابتداء غزل اور نظم کی مقبولیت اور عدم مقبولت کے جائزے سے ہوتی ہے۔ اس بحث میں حالی کے مقدمہ شعر و شاعری، اردو غزل پر حالی کی نکتہ چینی کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا ہے (۲)

حالی کے بعد بھی غزل اور غزل نگاروں پر پےَ در پےَ حملے ہوتے رہے یوسف صاحب کی کتاب نے مسکت جواب فراہم کر دیا۔ چنانچہ عبدالمغنی بھی اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔

"یہی وجہہ ہے کہ دور حاضر میں غزل پر کئے جانے
والے حملوں کا بہت ہی موثر جواب اس کتاب کے
ذریعے دیا گیا" (۳)

یہاں اس بات کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ غزل کے ساکت جوہڑ میں پہلا پتھر حالی ہی نے پھینکا تھا۔ ان کا مقصد شاید لوگوں کو حالات کا احساس دلانا تھا اور غزل کی زوال پذیری سے آگاہ کرنا تھا۔ جہاں حالی اس مقصد میں کامیاب رہے وہیں غزل کی وکالت میں اس کے بعد جتنی چیزیں لکھی گئیں اس میں شعوری یا غیر شعوری طور پر حالی کے مباحث کا جواب دینے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یوسف صاحب اپنی بالغ نظری کی وجہ سے حالی کی غزل گوئی کے بانکپن کے منکر نہیں چنانچہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حالی کو صنف غزل بہ حیثیت ایک شعری پیمانے کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہ تھا۔ البتہ حالی کو اپنے عہد کے ان شعراء سے سخت شکایت تھی جنہوں نے اس پیمانے کو غلط طریقے پر برتا اور اردو غزل کو رسوائے زمانہ بنایا۔ اس بناء پر حالی کی شریعت میں غزل کو شجر ممنوعہ قرار دیا گیا۔ حالی نے عصری تقاضوں کی تکمیل میں ادب میں افادیت اور مقصدیت کے جس نظریہ کو پیش کیا تھا اس کی تکمیل حالی کی نظر میں غزل کی بجائے نظم ہی کر سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے پوری شدت کے ساتھ غزل کی مخالفت کی اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر غزل کی برائیاں بتائیں اور پوری قوت نظم کی حمایت میں لگادی اور خود بھی کلاسیکی رنگ کی طرح دار عشقیہ غزلیں کہنے کے بجائے جس پر وہ استادانہ قدرت رکھتے تھے، طویل نظموں کی طرف مائل ہوئے بلکہ "مدوجزر اسلام" کے نام سے ایک طویل مسدس لکھ کر ہم عصر غزل گو شعراء کو نظم گوئی کی ترغیب دلائی یہ نظم آج بھی اردو ادب کی تاریخ میں طویل ترین نظم سمجھی جاتی ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے "اردو غزل" پر مولانا حالی کی طرف سے لگائے

ہوئے تمام الزامات کا فرداً فرداً جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حالی کے یہ تمام الزامات وقتی تھے اور وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے حالی نے مصلحتاً غزل سے منہ موڑلینے کا مشورہ دیا تھا ورنہ واقعتاً دیکھا جائے تو غزل تمام الزامات سے بری ہے۔ مثال کے طور پر فحش اور عریاں نگاری کے موضوع پر یوسف صاحب کہتے ہیں کہ اگر آج مولانا حالی زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ غزل سے بھی کہیں زیادہ موثر انداز میں افسانوں، کہانیوں اور ناولوں کے ذریعے فحش گوئی وغیرہ کا عمل جاری ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا سخت افسوس بھی ہے کہ حالی کی ادبی اور اصلاحی تحریک کے سبب غزل کو بڑی حد تک نقصان پہنچا۔ اس میں شک نہیں کہ نظم گوئی کے فن نے پوری آب و تاب کے ساتھ فروغ پایا اور حالی کے بعد شعراء کا ایک قافلہ چل پڑا جس کے سالار اقبال قرار پائے۔

ڈاکٹر یوسف صاحب غزل کے تعلق سے مولانا حالی کے نظریات سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حالی نے غزل کے جو نقائص بیان کئے ہیں وہ محض عارضی اور ہنگامی حالات کا نتیجہ تھے اور ان کی نظر میں غزل کا معیار پست ہونے اور اس کے دائرہ کار کے محدود ہونے کے اسباب کچھ اور ہیں۔

غزل کے معیار کی پستی کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے پہلے پہل غزل ہی کو اپنا تختہ ۔ مشق بناتے ہیں۔ عروض کی چند کتابیں پڑھیں اور اپنے آپ کو غزل کہنے کا اہل سمجھنے لگے۔ غزل گوئی اس دور کی تہذیب کا ایک ایسا کمال سمجھا جاتا تھا کہ امیر امراء، امیرزادے اس فن کی تحصیل کو اپنی عزت و توقیر میں اضافہ کا سبب جانتے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ ان کی طبعیت میں کس حد تک شعر گوئی کی فطری صلاحتیں ہیں ہر کس و ناکس غزل گوئی کا دعویدار بن جاتا تھا اس سے صنف غزل کو نقصان پہنچا۔

یوسف صاحب نے غزل کے معیار کی پستی کا ایک سبب نظم گوئی کی آسانی کو بھی بتایا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں ۔

"ہمارے زمانے کے ترقی پسند نوجوانوں کو غزل کے مقابلے میں نظم اس لئے بھی پسند ہے کہ اس کا لکھنا نسبتاً آسان ہے ۔ غزل جتنی ریاضت چاہتی ہے وہ ان کے بس کی بات نہیں، دوسرے یہ کہ اس طبقے میں غزل کی پابندیاں اور آداب مقبول نہیں اس لئے کہ انہیں برتنے کا ان لوگوں میں جیسا چاہیے ویسا سلیقہ اور ذوق نہیں ۔" (۴)

یوسف صاحب نے اردو ادب کی تاریخ کے اس دور کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا ہے جس میں غزل کی مقبولیت گھٹ رہی تھی ۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مغربی تہذیب اور مغربی ادب کی پرستاری نے بھی صنف غزل کی مقبولیت کو متاثر کیا مگر وہ غزل کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوئے ۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ایک دور پھر آئے گا جب کہ غزل اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ افق ادب پر چھا جائے گی چنانچہ اپنے تنقیدی جائزے میں لکھتے ہیں ۔

" مغربی ادب کے زیر اثر ممکن ہے غزل نگاری کو عارضی طور پر روز بد دیکھنا پڑے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غزل اس جوکھم کو جھیل جائے گی ۔ اس میں اتنی قوت حیات موجود ہے کہ تھوڑا بہت ظاہری روپ بدل کر پھر اپنی گدی پر براجمان ہو جائے ۔ (۵) ۔

یوسف صاحب کی یہ پیشن گوئی حیرت انگیز حد تک صحیح ثابت ہوئی اور چند

ہی سال کے اندر دیکھتے ہی دیکھتے غزل نے نہ صرف حالی کی اصلاحی تحریک کو بلکہ ترقی پسندوں کی اشتراکیت کو بھی اپنا لوہا ماننے پر مجبور کر دیا۔ حالی کے بعد اقبال اور غزل گو شعراء میں حسرت جگر، فانی اور اصغر جیسے شعراء نے اردو غزل کو نئی زندگی بخشی۔ ترقی پسند تحریک کے ان چوٹی کے شعراء نے جنہوں نے نظم گوئی کو بطور خاص اپنی ترجمانی کا وسیلہ بنایا تھا وہ بھی ہار مان کر غزل ہی کی طرف لوٹ آئے اور چند نے اپنے انقلابی افکار اور نظریات کو کچھ اس طرح باندھا کہ ان کی غزل کے ہر شعر میں زمانے کے دل کی دھڑکن کو آسانی کے ساتھ محسوس کیا جاسکتا تھا۔ اس دور کے منتخب روزگار شاعر فیض احمد فیض ہیں جنہیں نظم نگاری اور غزل گوئی پر یکساں دسترس حاصل ہے بلکہ ایک طرح ان کی نظموں کی دل آویزی میں غزل کی رعنائی جھلکتی ہے۔ مخدوم جیسا نظم نگار بعد کے دور میں غزل کا رسیا بن گیا اور یہ بھی یاد رہے کہ اکثر بڑے ترقی پسند شاعروں نے نظموں کے ساتھ ساتھ دل کے مشورے سے غزلیں بھی کہی ہیں۔

بیسویں صدی کے شعری ادب میں غزل اور نظم کی داخلی ہم آہنگی سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے جدید غزل کے مختلف داخلی پہلوؤں کا تجزیہ کیا ہے۔ جن میں بعض اہم موضوعات حسب ذیل ہیں۔

رمزیت، کنایہ، غزل کا موضوع، استعارے کی رمزآفرینی، لفظ اور معانی، علامتی لفظ، رنگ و بو کے شعری محرکات، داخلیت اور خارجیت، رومانیت اور غزل کے سماجی محرک وغیرہ۔

رمزیت

دور قدیم کے کلاسیکل شعراء کی طرح یوسف صاحب تغزل کے لئے رمزیت کو لازم و ملزوم گردانتے ہیں۔ رمزیت کا موضوع بھی اپنے طور پر تفصیلی بحث کا متقاضی ہے اس لئے انہوں نے مختلف زاویوں سے رمزیت کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی

ہے۔ مثلاً یہ کہ تخیل کا اندرونی اور خارجی عالم رمزی استعارے یا استعارے کی رمزآفرینی وغیرہ۔

درون بینی اور رمزیت کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ غزل گو شعراء کی درون بینی زبردست تخلیقی قوت میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسے اپنے اندر جو عالم نظر آتے ہیں وہ خارجی عالم کی رنگا رنگی سے کہیں زیادہ دلکش اور حسین ہوتے ہیں درون بینی کا تعلق زور تخیل اور حسن تخیل سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ شاعر جو کچھ اپنی خارجی دنیا میں نہیں پاتا وہ اپنے تخیل و جذبہ کی مدد سے پیدا کر لیتا ہے۔ بعض دفعہ تو یوں بھی ہوتا ہے کہ حقیقی دنیا میں چاہے کچھ ہو کہ نہ ہو مگر شاعر کی داخلی دنیا میں تخیل و جذبہ کے فیض سے یہ سب کچھ اس کے اندر ہی موجود ہوتا ہے۔(۶)

کنایہ

کبھی شاعر کی درون بینی اپنے تخیل و جذبہ کی تشفی کا سامان محبوب کی ذات میں تلاش کرتی ہے یہ بھی ایک طرح کی درون بینی ہے۔

رمزیت اور اشاریت کے لئے کنایہ اور استعارے بھی غزلیں میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ گل و گلشن کے صدہا استعاروں اور رمزی اشاروں کی مدد سے شعراء نے اپنے کلام کو اچھوتا و منفرد بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن کے تحت یوسف صاحب نے میر، غالب، مومن سے لیکر حسرت، اقبال اور فیض سب ہی کے کلام سے مثالیں پیش کی ہیں۔

استعارے کی رمزآفرینی

رمز اور کنایہ کے ساتھ ساتھ غزل کے حسن تغزل میں استعارے کی بھی اہمیت ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ تشبیہ، استعارے اور کنایہ کی مدد سے لفظوں کے معانی و مفہوم میں وسعت پیدا کی جا سکتی ہے۔ لفظوں کو نئے معانی اور مفہوم عطا کئے

جا سکتے ہیں۔ان میں معنوی قوت اور تازگی پیدا کی جا سکتی ہے اور پھر ان ہی کی مدد سے شعر میں تاثیر بھی پیدا ہوتی ہے۔(۷)

یوسف صاحب نے مختلف شعراء کے کلام کی روشنی میں استعارے کی اہمیت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کی نظر میں استعارے صرف کلام کو زینت ہی نہیں بخشتے بلکہ شاعر کی تخلیقی قوت کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ کسی شاعر کی عظمت کا اندازہ اس کے استعاروں کی قوت، تازگی اور بلندی سے کیا جا سکتا ہے،۔معانی کی صحت سے زیادہ غزل گو شعرا کے پیش نظر استعارہ بالکنایہ کی صحت ہوتی ہے۔زندگی اور خارجی حقیقت کی ہو بہو نقل کی بجائے استعارے اور کنایہ سے اس کی توجیہ اور بازآفرینی کا کام لیا جاتا ہے۔

لفظ اور معانی

لفظ و معانی کے باب میں غالب کا نظریہ شعر قول فیصل کا درجہ رکھتا ہے۔ جس نے آج سے سوڈیڑھ سو سال پہلے کہا تھا کہ "شاعری قافیہ پیمائی نہیں معانی آفرینی کا نام ہے۔یوسف صاحب بھی اردو غزل کے مختلف عناصر ترکیبی میں لفظ اور معانی کی اہمیت سے تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غزل گو شاعر اپنے اندرونی جذبوں کی ترجمانی کے لیے موزوں لفظ تلاش کرتا ہے اور کبھی لفظوں کے لئے معنی لفظ اور معنی کے صحیح ربط سے ہی حسن ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے۔اسی لئے موزوں اور متناسب الفاظ کے انتخاب سے ہی شعر میں ترنم کی کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے اور شعر کا ترنم جذبہ کے اتار چڑھاؤ کا عکس ہوتا ہے۔اسی لئے شاعری میں الفاظ اور معانی کو فنی طور پر برتنے کے سلیقے کو ایک علم کا درجہ حاصل ہے جسے علم معانی کہا جاتا ہے۔اسی علم کے تحت صنائع لفظی و معنوی کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔جیسے صنعت حسن تعلیل، مبالغہ، تضاد مقابلہ، ابہام، مرعاۃ النظیر اور تجاہل عارفانہ یہ تمام صنعتیں حسن تغزل کے لئے لازمی

شرائط کا درجہ رکھتی ہیں۔اردو کے کلاسیکل غزل گو شعرا۔ سے لے کر جدید غزل گو شعرا نے بھی ان صنعتوں کے التزام کو بطور خاص ملحوظ رکھا ہے۔لفظ اور معانی کے تعلق سے جو بحث ہم کو حالی کے مقدمہ شعر و شاعری میں ملتی ہے وہی بحث ہم تفصیل اور تجزیہ کے ساتھ یوسف صاحب کے پاس دیکھتے ہیں۔چنانچہ وہ لفظ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔

> "ہر لفظ کی ایک جوہری انفرادیت ہوتی ہے چنانچہ کسی ایک لفظ سے جو خیالی تلازمات اور ذہنی متعلقات پیدا ہوتے ہیں وہ اس سے مترادف لفظوں سے کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کسی ایک زبان کا شعر دوسری زبان میں جیسا ترجمہ ہونا چاہیے ویسا نہیں ہو سکتا۔نہ صرف یہ کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں شعر کا ترجمہ نہیں ہو سکتا بلکہ خود اس زبان میں جس میں شعر کہا گیا ہے اگر آپ لفظوں کی ترتیب بدل دیں تو اس کی تاثیر فنا ہو جائے گی۔"۔(۸)

لفظ جہاں معانی آفرینی میں ایک کلیدی رول ادا کرتا ہے وہیں شعر میں آہنگ اور ایک لطیف ربط بھی اسی سے قائم رکھا جاسکتا ہے۔موزوں اور مترنم الفاظ کی اہمیت تو اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب شعر وزن، بحر، قافیہ اور ردیف کا پابند ہوتا ہے۔

علامتی لفظ

بحر اور ردیف وقافیہ کے موزوں انتخاب کے علاوہ غزل گو شاعر کبھی ایسے لفظ

استعمال کرتا ہے جن کے ساتھ ایک مخصوص شعری تصور صدیوں سے وابستہ رہا ہے۔
یہ علامتی الفاظ رمزاور اشاروں کا بھی کام دیتے ہیں اور کبھی ایک خاص اصطلاح میں بھی برتے جاتے ہیں۔ایسے علامتی الفاظ شاعر کے تخیل کو بلندی۔ فکر، گہرائی و گیرائی بخشتے ہیں اور تصور کو حقیقت آشنا بناتے ہیں۔شاعران کی مدد سے اپنے کلام میں ندرت پیدا کر سکتا ہے۔غالب کی جدت پسندی اور ندرت خیال کی تہہ میں علامتی لفظ ہی کا راز چھپا ہوا ہے۔جیسے جنون و گریبان، طوق و زنجیر، موج و تلاطم، قفس و آشیاں، برق و بجلی، گلشن و صیاد، ساحل و سمندر، صحرا و سراب، ساقی و شراب ایسے بیسیوں علامتی الفاظ ہیں جن سے شعراء نے رمز و اشاریت کا بھی کام لیا ہے اور انہیں مخصوص اصطلاحوں میں برت کر اپنے فلسفیانہ افکار کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش بھی کی ہے۔غزل گو شعراء نے علامتی الفاظ کے استعمال سے ہی اپنے کلام کو ہر وقت ایک نیالب و لہجہ اور رنگ و آہنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ میر سے لیکر حسرت تک جتنے بھی نامور غزل گو شعراء ملتے ہیں ان کا حسن تغزل ان ہی علامتی الفاظ کا رہین منت رہا ہے۔

رنگ و بو سے شعری محرکات

معنیٰ آفرینی اور حسن ادا کے ساتھ ساتھ غزل کے مطالعہ میں رنگ و بو کے شعری محرکات بھی غزل میں ایک لطیف احساس پیدا کرتے ہیں۔ حسن فطرت میں رنگ و بو کی جو اہمیت ہے اس کی وہی اہمیت حسن تغزل میں بھی ہے۔غزل میں تازگی لطافت اور تاثیر پیدا کرنے کے لئے شاعر کو کبھی کبھی رنگ و بو سے بھی کام لینا پڑتا ہے وہ حسن کائنات سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کیفیتوں کو اپنے کلام میں باندھنے کی کوشش کرتا ہے جن کی مدد سے اس کے کلام میں تازگی پیدا ہو۔ شگفتگی و شادابی آئے۔رنگ شفق ہو کہ نکہت گل، آبشار کا شور ہو کہ دریاؤں کی نرم خرامی، سمندر کا تلاطم ہو کہ

ساحل کا سکون، بہار کی رنگینی ہو کہ خزاں کی بے رنگی ایسے رنگ و بو کے سینکڑوں قافلے ہیں جو شاعر کے تخیل میں، تصور میں اور اس کی نگاہوں کے سامنے سے ہمیشہ گزرتے رہے ہیں۔ باکمال شاعر جس کو زبان اور بیان پر قدرت حاصل ہو وہ ان قافلوں سے اپنے ضرورت کے مطابق کچھ نہ کچھ مستعار لے لیتا ہے۔ انہوں نے شاعروں کے کلام سے ایسے بیشمار اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے جن میں قوس قزح کی ہمہ رنگی اور گلوں کی رنگت رچی بسی ملتی ہے۔ انہوں نے ایسے اشعار کو بھی پیش کیا ہے جن میں رنگ و بو کو جذباتی محرک کی حیثیت سے بھی برتا گیا ہے۔ بعض اشعار میں رنگ و بو کی حسی کیفیت بھی ملتی ہے بعض میں مستی و نشاط کی بھی۔ بعض اشعار میں خوشبو کا حسی تجزیہ بھی ملتا ہے۔ رنگ حنا کو ہی لیجئے سینکڑوں مضمون اس سے نکالے گئے ہیں اور سو ڈھنگ سے اس رنگ کو باندھا گیا ہے۔ رنگ حنا کو رنگ وفا بھی کہا گیا ہے۔ مثلاً ثاقب لکھنوی کا یہ شعر

مرے لہو سے اگر ہو کے سرخرو آئے
لو تو برگ حنا میں وفا کی بو آئے (۹)

داخلیت اور خارجیت

غزل کے جمالیاتی محرکات کا تعلق کچھ تو شاعر کی داخلی کیفیتوں سے ہوتا ہے کچھ اس کے خارجی ماحول سے۔ مگر دونوں کیفیتوں میں حسیت قدر مشترک ہوتی ہے شاعر کا سوز دروں، شاعر کے احساسات، زور تخیل، لطافت خیال، زور بیان اور حسن ادا ان تمام خوبیوں پر جس شاعر کو ماہرانہ قدرت حاصل ہو وہی شاعر غزل کے داخلی اور خارجی تقاضوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ داخلی کیفیتوں میں اس کا جذبہ عشق، واردات قلب اور اس کے لطیف احساسات اہمیت رکھتے ہیں۔ خارجی کیفیتوں میں شاعر کا وسیع مطالعہ، مشاہدہ قدرت، ذوق نظر، جمالیاتی ذوق، حسن فطرت سے

اس کا والہانہ شغف یہ سب کچھ غزل کی خارجی کیفیتوں کی صورت گری میں معاون و مدد گار ثابت ہوتے ہیں ۔ان ہی کی مدد سے شاعر اپنے کلام میں یا اپنی غزل میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا کر سکتا ہے ۔اپنے تخیل کو بلندی ۔فکر کو تازگی عطا کر سکتا ہے ۔ انسانیت کی اعلیٰ اقدار کے نشو و نما میں بھی شاعر کی داخلی اور خارجی کیفیتیں زمانے کے تغیرات کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں اور یہ تغیر بھی حسن تغزل کی تازگی کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے ۔ورنہ فن میں ایک طرح کا جمود پیدا ہونے کا خدشہ لگا رہتا ہے ۔ مثلاً یہ کہ میر کے بعد اگر میر ہی پیدا ہوتا تو میر کے فن میں ایک طرح کا ٹھیراؤ اور جمود آجاتا ۔ میر کے بعد غالب کا پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ میر کا فن ساکت و جامد نہیں ہے بلکہ زندہ توانا، متحرک اور تغیر پذیر ہے ۔اس لئے غزل میں ہو یا شاعری میں داخلی اور خارجی کیفیتوں کا ایک خاص اثر ہوتا ہے ۔

داخلیت اور خارجیت کی بحث کے بعد ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے غزل کے نفسیاتی تجزیہ کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے ۔وہ لکھتے ہیں کہ غزل ادبی صنف کے طور پر ان قوموں کا ورثہ رہی ہے جن کے جذبات کی شدت کا دنیا کو علم ہے ۔ان کے جذبے اور تخیل کا لطیف ترین اظہار اگر کہیں ہوا ہے تو وہ غزل کی شکل میں ہوا ہے ۔غزل کی بنیاد پہلے عربی ادب میں پڑی پھر عربی ادب کے اثر سے فارسی میں اس کا رواج ہوا ۔ فارسی سے ترکی اور اردو میں آئی ۔غرض کہ مشرقی دنیا کی چار سب سے بڑی اور اہم زبانوں میں غزل ۔نے مقبولیت حاصل کی ۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل اس روحانی اور جذباتی زندگی کی علامت بن گئی جس کی پرورش ایشیائی ممالک کی اسلامی تہذیب کے دامن میں ہوئی ۔غزل کے جذباتی ادب سے پہلے دنیا کے مہذب ملکوں میں عشق و محبت کی زمزمہ سنجی کا لہجہ کچھ اور تھا ۔کہیں تو یہ جذبہ، عشق دیو مالائی قصوں، کہانیوں اور داستانوں میں چھپا ہوا تھا ۔کہیں سنگ تراشوں کی شاہکار تخلیقوں میں سانس لے رہا تھا ۔

دیو مالائی کہانیاں، ہوں کہ فن ڈرامہ ہو، فنِ رقص ہو یا مجسمہ سازی یہ تمام فنون جذبہ عشق کے اظہار کا وسیلہ ضرور تھے لیکن ان میں ذوق جمالیات کی وہ حرکیاتی کیفیت نہیں ملتی تھی جو جذبہ عشق کا تقاضا ہے۔ غالباً اسی کمزوری کی بنا پر یونانی مفکرین کو فن کے تعلق سے یہ احساس ہوا ہوگا کہ فن بذات خود کوئی تخلیقی قوت نہیں ہے بلکہ نقل کی نقل ہے۔ یہ فنون لطیفہ کے تعلق سے ہی نہیں بلکہ جذبہ عشق کے تعلق سے بھی ایک ساکت و جامد نظریہ تھا۔ اسی نظریہ کو اگر کسی نے توڑا تو وہ اسلامی فکر نے۔ ذیل کے اقتباس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔

> " اس کلاسکی فکر کے خلاف اسلام تہذیب کے ہر شعبے میں ایک زبردست رد عمل تھا اور نقل و تکرار کے بجائے جذب و تخلیق کا عمل بردار تھا۔ اس طرح عمل اور تاریخ کی دنیا میں اس نے کلاسکی تصور کو بدل دیا اسی طرح آرٹ اور ادب میں اس نے رومانیت کی بناء ڈالی۔ (۴)

اسلامی اثر سے جس رومانیت نے جنم لیا وہ ادب میں ایک زبردست انقلاب کا باعث ہوئی۔ قوموں کی دبی ہوئی آرزوئیں اس محرک کی بدولت ابھر آئیں۔ عشق نے نیا مزاج پایا اور ادب میں گرمی اور سپردگی کا اظہار ممکن ہوا جو اس سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا۔ عربوں نے اپنے ادبیات میں جنسی جذبہ کی کمال بینی پیدا کی۔ جس کا اظہار غزل میں ہوا۔ اسلامی عہد کے ابتدائی عرب شاعروں کا تغزل مجاز کی اسلامی داستاں سرائی ہے۔ مجاز ہی ان کے لئے سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس لئے ان کے انداز میں جوش اور شدت پائی جاتی ہے۔ عرب غزل نگاروں کے طفیل میں مغرب کی ٹھنڈی مٹی بھی گرمائی۔ چنانچہ عربوں ہی کے اثر سے یورپ میں غنائی شاعری LYRIC نے جنم

لیا۔اسپین، جنوبی فرانس، سسلی اور جنوبی اٹلی عشق و شوق کے نغموں سے گونج اٹھے جس طرح عربی میں عاشقانہ شاعری علامتی اور رمزی تھی اسی طرح یورپ میں غنائی شاعری نے بھی یہی انداز اختیار کیا اور آج تک اس کا اثر پوری طرح زائل نہیں ہوا۔

جب عرب ایران پہنچے تو وہاں عربی ادبیات نے کچھ اپنا اثر ایرانی ادبیات پر ڈالا اور کچھ ایرانی ادبیات کا اثر عربوں نے قبول کیا۔اس طرح کے امتزاج سے غزل کا ایک پیکر تیار ہوا۔غزل میں بھی کچھ دیومالائی کیفیت پیدا ہوئی، غزل کا ہیرو عاشق کہلایا، دائمی غم غزل کا وصف ٹھہرا۔ریگستان اور کوہستان فطری پس منظر کا کام دینے لگے جو سخت کوشی، تنہائی اور جذباتی شدت کی علامتیں ہیں۔اس پس منظر میں عشق جمالیاتی عین کی حیثیت اختیار کرتا گیا۔لیلی اور مجنوں کی طرح فرہاد اور شیریں بھی غزل کے جمالیاتی پیکر قرار پائے۔اس طرح سے جذبہ۔ عشق کے تحلیل نفسی میں رومانیت کا سراغ ملتا ہے۔اور یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اردو غزل میں رومانیت کے اثرات کتنے گہرے ہیں۔

غزل کے سماجی محرک

قدیم کلاسیکی غزل کی تاریخ میں ہمیں ایسے غزل گو شعرا. بھی ملتے ہیں جنہوں نے تخیل اور جذباتی حقیقت پر زیادہ زور دیا اور یہ صنف سخن حسن و عشق کے معاملوں کے لئے مخصوص ہو گئی۔لیکن عصری تقاضوں کے ساتھ اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ادراک اور علم کے حقائق بھی غزل کے مضامین میں سموئے جائیں تاکہ خارجی عالم کی بصیرتیں شاعرانہ طور پر ہماری زندگی سے ہم آہنگ ہو سکیں۔

ابتداء میں یوسف صاحب نے شاعری کی اہمیت و افادیت کے تعلق سے حالی کے نظریات کا تجزیہ کرتے ہوئے اس امر سے اختلاف کیا تھا کہ کم از کم غزل کے معاملے

میں مقصدیت اور افادیت پر زیادہ زور نہ دیا جائے ۔ لیکن جو بحث انہوں نے غزل کے سماجی محرک کے عنوان سے اٹھائی ہے اس میں خود اپنے نظریہ سے تھوڑا سا اختلاف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ۔

"غزل کی صنف کو اگر ہمارے ادب میں زندہ رکھنا
ہے تو جدید زمانے کی زندگی سے اسے اور زیادہ
قریب لانا ہوگا (۱۱)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تنقیدوں میں بعض وقت اس طرح کا تضاد بھی ملتا ہے جس سے ان کے افکار کہیں الجھ بھی جاتے ہیں او کہیں کہیں ژولیدہ بیانی کا باعث بھی بنتے ہیں ۔ اپنے اس نظرئے کی تائید میں یوسف صاحب نے ایسے کئ اشعار پیش کئے ہیں جن میں سماجی محرکات کا اثر بھی جھلکتا ہے اور غزل کے حسن تغزل میں بھی کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا مثلاً راجا رام نارائین موزوں کا وہ شعر جو نواب سراج الدولہ والی بنگال کے شہید ہونے پر فی البدیہ کہا گیا تھا ۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری (۱۲)

ان کے خیال میں غزل کو مقصدیت و افادیت سے ہم آہنگ کرنے کے لئے غزل کی تکنیک میں تبدیلی ضروری نہیں ۔

غزل کا موضوع

اردو غزل کے تنقیدی جائزہ میں غزل کا موضوع مرکزی اہمیت کا حامل ہوتا ہے ۔ یوسف صاحب نے موضوع کی اہمیت کے مدنظر اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے ۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ غزل اپنی لغوی اور اصطلاحی معنوں و مفہوم کے اعتبار سے ابتداء ہی سے عشق مجازی کی علمبردار رہی ہے ۔ ایرانی اثرات کے سبب جب اس میں

تصوف کا عنصر داخل ہوا تو پھر غزل میں عشق مجازی کے ساتھ ساتھ عشق حقیقی کی روح جلوہ گر ہوئی ۔ غزل گو شعراء کا کمال یہ ٹھہرا کہ عشق مجازی اور عشق حقیقی کو اس طرح باندھا جائے کہ یہ فرق یا تو بالکل محسوس ہی نہ ہو یا محسوس ہو بھی تو حد فاصل کم سے کم ہو ۔ یہیں سے غزل میں رمزیت اور اشاریت کا رجحان آیا تاکہ حقیقت اور مجاز کے فرق و امتیاز کو مبہم رکھا جائے ۔ اس کوشش میں محبوب کی جنس کو بھی ابہام کے پردے میں چھپا دیا گیا ۔ ادب غزل گو شعراء کا شیوہ یہ قرار پایا کہ وہ خلوت اور پردے کی بات کو صاف صاف بیان نہ کریں ۔ تصوف کی چاشنی سے غزل کو ایک فائدہ یہ پہنچا کہ غزل میں جنسی میلانات کے تذکرے سے گریز کیا جانے لگا اور جذبہ عشق کے تقاضوں کے بیان میں وصال کی آرزومندی میں ، فراق کے اضطراب میں ، حسن کے سراپے کے بیان میں تہذیب و شائستگی کو ملحوظ رکھا جانے لگا ۔ کہیں کہیں اس احتیاط سے انحراف بھی برتا گیا ہے جس کی وجہ سے جہاں غزل گو شاعر کے وقار پر حرف آیا ہے وہیں غزل کی ساکھ کو بھی نقصان پہنچا ہے ۔ جس کی عمدہ مثال ہم کو دبستان لکھنو کے غزل گو شعراء کے کلام میں ملتی ہے ۔ اردو غزل میں اس بے راہ روی کی بدترین مثال بعض شاعروں کی ریختی گوئی ہے ۔ غزل کو ان عیوب سے پاک رکھنے کے لئے رمز و ایما کی کیفیت کو بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس رجحان کو غالب نے عام کیا ۔ یہ شعر مثال کے لئے کافی ہے ۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا ، اشارت کیا ، ادا کیا

یہ گویا غزل میں رمز اور ایما کے لازمی شرائط ہیں ۔ عہد حاضر کے سب سے بڑے غزل گو شاعر حسرت نے بھی اس بات میں غالب کے خیال کی تائید کی ہے

ہر حرف میں اس نامہ رنگیں کے ہیں پنہاں
جدت کے ، عبارت کے ، اشارت کے لذائذ

یعنی تغزل کی تاثیر کا راز اس میں ہے کہ عبارت، اشارت اور حسن ادا کے رنگ سے تخیل اور جذبے کی تصویر کی رنگ آمیزی کی جائے۔ ان رنگوں کی آمیزش کے لئے بڑا سلیقہ درکار ہے۔ غزل محض شاعر کا کلام نہیں بلکہ عاشق کا کلام ہے۔ اس لئے غزل پر وہی اصول عائد ہونے چاہیں جن کی جھلک غالب اور حسرت جیسے حساس طبائع رکھنے والوں کے کلام میں نظر آتی ہے۔

اردو غزل پر تبصرہ کرنے کے لئے جس طرز بیان کی ضرورت تھی اس کا حق یوسف صاحب نے پوری طرح ادا کیا۔ یہ کتاب انشاپردازی کا ایک دلکش نمونہ بن گئی ہے۔ چنانچہ صباح الدین عبدالرحمن نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے

"جس صاف ستھری اور نکھری ہوئی اردو میں یہ تحریر قلمبند ہوئی اس کی شان پوری "اردو غزل" میں جلوہ گر ہے جس کا انشاپردازانہ انداز ارباب ذوق کے ادبی کام و دہن کے لطف و لذت کا باعث بنا رہے گا"

(۱۳)

غرض "اردو غزل" پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا تنقیدی جائزہ ایسے تمام موضوعات کا احاطہ کرتا ہے جن سے اردو غزل کے عناصر ترکیبی اور اس کے رنگ و آہنگ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے کتاب کے نصف آخر کا حصہ ابتدا۔ سے لے کر جدید غزل گو شعرا۔ تک کے منتخب اشعار پر مشتمل ہے۔ جن کی روشنی میں ہم اردو غزل کے مختلف اسالیب سے روشناس ہو سکتے ہیں۔

حوالے

---

(۱) ڈاکٹر عبد المغنی ۔یوسف حسین خان ۔عالم یا ناقد ۔ہماری زبان صفحہ (۶) ۱۵ جنوری ۱۹۸۰

(۲) نوٹ ۔۔۔یوسف صاحب کی کتاب سے بہت پہلے علی گڑھ کے ایک جوان مرد انشاء پرداز سجاد انصاری نے حالی جیسے خوش ذوق غزل گو کے نظم نگار بن جانے پر بڑی آزردگی اور افسوس کا اظہار کیا تھا۔

(۳) ڈاکٹر عبد المغنی ۔یوسف حسین خان ۔عالم یا ناقد ۔ہماری زبان (۶) ۱۵ جنوری ۱۹۸۰۔

(۴) ڈاکٹر یوسف حسین خان، اردو غزل، صفحہ (۸)

(۵) ڈاکٹر یوسف حسین خان، اردو غزل، صفحہ (۱۰)

(۶) ڈاکٹر یوسف حسین خان، اردو غزل، ماخوذ صفحہ (۳۱)

(۷) ڈاکٹر یوسف حسین خان، اردو غزل، ماخود صفحہ (۱۵۸)

(۸) ڈاکٹر یوسف حسین خان، اردو غزل، صفحہ (۱۷۰)

(۹) ڈاکٹر یوسف حسین خان، اردو غزل، ماخوذ صفحہ (۲۰۶)

(۱۰) ڈاکٹر یوسف حسین خان، اردو غزل، صفحہ (۳۲۴)

(۱۱) ڈاکٹر یوسف حسین خان، اردو غزل، صفحہ (۳۵۱)

(۱۲) ڈاکٹر یوسف حسین خان، اردو غزل ماخوذ صفحہ (۳۵۷)

(۱۳) صباح الدین عبد الرحمن، ڈاکٹر یوسف حسین خان مرحوم، ہماری زبان، ۱۵ جنوری ۱۹۸۰ صفحہ (۷)

حسرت کی شاعری

بیسویں صدی کے نسف اول میں جب اردو غزل کا احیا. ہوا تو اردو غزل کے رنگ تغزل میں نئے رجحانات اور نئے موضوعات کو نئے لب و لہجے کے ساتھ برتنے کا ایک عام رجحان پیدا ہوا۔ اس دور کو اردو غزل کا دور جدید کہا جاتا ہے۔ حالی کے اصلاحی دور کے بعد جدید غزل گوئی کا دور بڑی اہمیت کا دور مانا جاتا ہے۔ اس میں غزل کی کلاسیکی روایات کے ساتھ ساتھ موضوعاتی اعتبار سے غزل کے مزاج کو بدلنے کی کوشش کی گئی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تنگنائے غزل میں وسعت مضامین کا اہتمام کرنے کے جرات مندانہ اقدام کا سہرہ غالب کے سر جاتا ہے۔

بقدر ظرف نہیں ہے یہ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے

غالب اردو کے وہ پہلے غزل گو شاعر ہیں جنہوں نے کلاسیکی غزل کی بیشتر مروجہ روایتوں سے انحراف کیا اور اس لیے عملی صورت گری میں غالب ہی کو تمام شعراء پر تقدم حاصل ہے کہ انہوں نے فلسفیانہ افکار کو بھی غزل کے پیمانے میں اس کمال کے ساتھ باندھا ہے کہ اس کے حسن تغزل میں بھی فرق نہ آئے اور ان کے فکری تخیل کی کماحقہ ترجمانی بھی ہو جائے۔ غالب کی اس روایت کو آگے بڑھانے والے بعد کے شعراء

میں حالی اور اس کے بعد اقبال کا نام سرفہرست آتا ہے ۔ انہوں نے غزل گوئی ہی میں نہیں بلکہ نظموں میں بھی غزل کی سی شعریت کے فطری رنگ کو اپنایا ہے جیسے " ساقی نامہ "" ذوق و شوق " اور " مسجد قرطبہ " وغیرہ ۔

اقبال کے علاوہ جدید غزل گو شعراء کا ایک خاص عہد ملتا ہے ۔ یہ بیسویں صدی کے نصف اول کا دور ہے ۔ اس عہد میں جدید غزل گوئی کی روایتوں کو اپنے رنگ تغزل سے مالا مال کیا گیا ۔ اس دور کے شعراء میں فانی بدایونی ، حسرت موہانی ، اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی کے نام نمایاں ہیں ۔ یہ سارے کے سارے شعراء اردو غزل گوئی میں جدید رنگ تغزل کے علمبردار رہے ہیں ۔ ان شعراء نے حکایت حسن و عشق ، داستان ہجر و وصال ، تذکرہ زلف و رخسار کے ساتھ ساتھ بیشتر سماجی اور سیاسی مسائل کو بھی اس حسن شعریت کے ساتھ باندھا ہے اور کہیں بھی یہ احساس نہیں ہونے پاتا کہ ان کا مخاطب کوئی ارضی محبوب ہے یا پھر سیاسی اور سماجی انقلابات کا پروردہ پیکر جمال ہے ۔ ان شعراء کی غزلوں میں غم زمانہ اور غم ذات اس طرح ہم آہنگ محسوس ہوتے ہیں ۔ جس طرح میر کے کلام میں جنہوں نے غم دوراں کو غم ذات میں سمو لیا تھا ۔

ان شعراء کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر ایک نے لب و لہجہ ، جذبات کی گرمی ، اور زندگی کے ساتھ رویہ کے اعتبار سے جداگانہ روش کو اختیار کیا ہے ۔ مثلاً فانی کے یہاں فنا فی الذات ہونے کی آرزو بھی اور عرفان غم بھی ہے ، اصغر گونڈوی اصل شہود ، شاہد و مشہود ایک ہے کہ قائل رہے ہیں اور اس بات کے بھی مدعی رہے ۔

رند جو ظرف اٹھالے وہی ساغر بن جائے

جگر تو سرتاپا عشق ہی کے شاعر تھے اور وہ نہ تو روایتی عشق کے قائل تھے اور نہ ہی ان کا محبوب روایتی ۔ وہ عشق کے معاملے میں حکیم مومن خاں مومن کے اس مسلک سے قریب تھے کہ محبوب کا تعلق جنس مخالف سے ہو اور آرزوئے وصل خیالی

نہیں بلکہ حقیقی ہو۔اسی کو وہ ایک صحت مند عشق تصور کرتے تھے۔انہوں نے اپنی غزلوں میں جہاں عاشق کے جذبات عشق کی ترجمانی کی ہے وہیں اپنے محبوب کے دل کی دھڑکنوں کو بھی محسوس کیا ہے۔جگر نے بھی داخلی کیفیتوں کے ساتھ خارجی حالات پر بھی نظر رکھی ہے اور اپنے عہد کے تقاضوں کا بھی احترام کیا ہے۔

حسرت جدید غزل گوئی کے ان شہسواروں میں پانچویں سوار ہیں۔اپنے لب و لہجہ کے اعتبار سے انفرادی رنگ رکھتے ہیں۔فانی، اصغر اور جگر کے مقابلے میں حسرت کی شخصیت میں بظاہر کچھ ایسی خصوصیات نہیں ملتیں جن سے ان کی عاشقانہ طبیعت کا پتہ چل سکے۔ان کی شخصیت پر تو زاہدانہ رنگ ہی نمایاں محسوس ہوتا تھا۔دوسرے یہ کہ ان کی عملی زندگی سیاست کے انتہائی غیر شاعرانہ ماحول میں گزری۔لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان کی شخصیت کی تہہ میں جو شاعر چھپا ہوا تھا وہ بڑا شوخ، بڑا رنگیلا اور عاشق مزاج تھا۔ان کی غزلیں عشقیہ مضامین کے چھلکتے ہوئے پیمانے ہیں۔البتہ انہوں نے سیاسی موضوعات کو بہت عمدگی کے ساتھ شراب عشق میں حل کر لیا ہے۔اپنی اس طرفہ طبیعت پر خود حسرت کو بھی کبھی کبھی حیرت ہوتی تھی چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

ہے عشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

جو بات حسرت کو ایک طرفہ تماشہ معلوم ہوئی وہ دراصل طرفہ تماشہ نہیں بلکہ شاعرانہ کمال ہے۔یہ قدرت و کمال اسی کو حاصل ہوتا ہے جو غزل گوئی میں استاد کا درجہ رکھتا ہو۔یعنی یہ کہ غزل کے تمام تقاضوں کی تکمیل پر غیر معمولی قدرت حاصل ہو۔حسرت کو اردو غزل گو شعراء میں جو غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوی وہ ان کے اسی حسن تغزل کی بناء پر ہوئی۔انہوں نے جب شاعری شروع کی تو اس وقت بقول ڈاکٹر صاحب دبستان لکھنو کے شاعروں میں جلال، امیر اور تسلیم کو نمایاں مقام

حاصل تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ حسرت کو تسلیم کے رنگ سخن نے اپنی طرف سب سے زیادہ مائل کیا جو نسیم دہلوی کے تلامذہ میں تھے۔ اسی طرح ان کی شاعری کا راستہ خاندان مومن سے مل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حسرت کے کلام میں مومن کی پرکیف رنگینی صاف جھلکتی ہے۔ ان کے یہاں بھی مومن کی طرح نازک خیالی، ترکیبوں اور بندشوں کی چستی اپنی بہار دکھاتی ہے خود حسرت کو بھی اس بات پر فخر رہا ہے

طرز مومن پہ مرحبا حسرت
تیری رنگیں بیانیاں نہ گئیں (۱)

یوسف صاحب جن کا مخصوص تنقیدی میدان "اردو غزل" رہا ہے۔ حسرت موہانی کی غزل سے ان کا متاثر ہونا ایک فطری عمل ہے۔ حسرت کی غزلوں سے ان کی وابستگی کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے حسرت کی شاعری پر ایک مستقل تنقیدی کتاب لکھی ہے۔ جس میں انہوں نے حسرت کو اپنا خراج عقیدت ناقدانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ایک مختصر مگر جامع کتاب ہے۔ جس میں حسرت کے شاعرانہ مسلک، رنگ تغزل اور عشقیہ شاعری کا بطور خاص تنقیدی جائزہ لیا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ حسرت کے اس کلام سے جس میں سیاسی و سماجی موضوعات ملتے ہیں، ان سے انہوں نے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ جس سے ان کے تاثراتی اور جمالیاتی نظریہ تنقید کا ثبوت ملتا ہے۔

یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ حسرت نے اساتذہ کے کلام کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا جس سے ان کے شعری ذوق کی تربیت ہوئی۔ فن کے اسرار و رموز کے ساتھ لفظوں کے صحیح اور غلط استعمال کے متعلق انہوں نے جو میعار قائم کیے اس سے جدید اردو شاعری نے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ (۲)

مشق سخن کے ساتھ حسرت نے اردو نثر کے میدان کو بھی اپنایا۔ ان کا رسالہ "اردوئے معلیٰ" ایک معیاری اردو رسالہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ جس کے ذریعے بے

شمار گمنام شاعر منظر عام پر آئے اور شعری ادب کی تنقید کا ذوق پیدا ہوا۔ اس طرح نہ صرف خود غیر دانستہ طور پر قدیم اساتذہ کے کلام سے متاثر ہوئے بلکہ جدید شاعری کا رشتہ اردو کی کلاسیکی ادب سے جوڑنے کی بھی کوشش کی جو حسرت کا بڑا کارنامہ ہے۔

یوسف صاحب حسرت کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ ان کے کلام میں تغزل کا قدیم رنگ بکھرے ہوئے انداز میں ملتا ہے۔ اساتذہ میں مومن اور نسیم کے علاوہ خاص طور پر میر، قائم، مصحفی اور غالب سے بھی متاثر ہیں جس کا خود حسرت نے بھی کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہتے ہیں

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

اس میں شبہ نہیں کہ حسرت نے مختلف اساتذہ سے فیض اٹھایا ہے لیکن ان کے رنگ تغزل میں ایک خاص انفرادیت ہے یعنی ان کی پوری شاعری واقعیت اور جذباتی کیفیت سے سرشار ہے۔ ان کے یہاں روح عصر بھی کارفرما نظر آتی ہے۔ اس لیے ان کے تغزل میں دوآتشہ کیفیت ملتی ہے۔ حسرت کو اردو شاعری میں ایک تحریک کا بانی اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ انہوں نے عشقیہ واردات کے ساتھ ساتھ زمانے کے کرب کو بھی سمولیا ہے۔

یوسف صاحب نے اپنی اس مختصر سی تصنیف میں حسرت کی عشقیہ شاعری کا ایک صحت مند انداز میں ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور اس بات کی گواہی دی ہے کہ ان کی شاعری کا اصلی محرک ان کا عشق پاکباز ہے۔ ان کے نزدیک زندگی محبت سے عبارت ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں عشق و محبت کے مختلف مدارج کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ اپنے تخیل کی مدد سے جنسی جذبہ میں تغزل کی کمال بینی پیدا کر دی ہے۔ وہ جس چیز کو عشق کہتے ہیں وہ خالص انسانی اور مجازی ہے۔ ان کے یہاں میر کے تہذیبی عشق کا رکھ رکھاؤ بھی ہے۔ اور مومن کی سی وارفتگی بھی۔ ان کی عشقیہ شاعری میں

افلاطونی عشق نہیں ملتا بلکہ اسی خاکدان میں بسنے والے انسانوں کے دل کا معاملہ پیش کیا ہے ۔ان کے عشقیہ موضوعات میں نسوانی حسن اور نسوانی محاسن کے موضوعات بھی ملتے ہیں ۔ جس کا بے حجابی اور عریانی سے کوئی واسطہ نہیں ۔ بقول یوسف صاحب حسرت کے تغزل میں طلسم حسن و جذبہ عشق آغوش در آغوش نظر آتے ہیں ۔ عشق و محبت کی وادی کا مسافر جذبہ شوق کی آواز پر کشاں کشاں چلا جاتا ہے اور اسے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کدھر جارہا ہے اور کیوں جارہا ہے چلتے چلتے تھک کر چور ہوجاتا ہے اور قریب ہے کہ گر پڑے لیکن قوت عشق اس کو تھام لیتی ہے ۔ گویا میر کی طرح حسرت بھی عشق کی مدد سے زندگی کو سلیقے سے نبھانے کا ہنر جانتے ہیں ۔

قوت عشق بھی کیا ہے کہ ہو کر مایوس
جب کبھی گرنے لگا ہوں میں سنبھالا ہے مجھے

یوسف صاحب نے حسرت کے تصور عشق پر بہت عمدگی سے تبصرہ کیا ہے لکھتے ہیں کہ جس طرح غالب کا عشق امیرانہ تھا میر صاحب کا عشق فقیرانہ تھا اسی طرح حسرت کا عشق شریفانہ ہے ۔" (۱۴)

ان تینوں استادوں کے یہاں معاشرتی ماحول اور محرکات نے ان کے لب و لہجہ میں ایک خاص انداز پیدا کر دیا ہے ۔

حسرت کی عشقیہ شاعری کے محرکات کا سراغ لگاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ حسرت کی عاشقانہ شاعری کے جمالیاتی جلوؤں میں ان کے تحت الشعوری یادوں کا بڑا دخل ہے ۔ احتیاط عشق کے باعث جن تمناؤں کا وہ کبھی اظہار نہ کرسکے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان ہی تمناؤں نے ان کے تحت الشعور کی دنیا میں پناہ لے لی تھی اور یہی چھپی ہوئی ناآسودہ تمنائیں شعر کے قالب میں ڈھلتی گئیں خود حسرت کو بھی اس کا اعتراف تھا ۔

کٹ گئی احتیاط عشق میں عمر
ہم سے اظہار مدعا نہ ہوا (۴)

یوسف صاحب کی نظر میں حسرت کے عشقیہ اشعار اسی غیر معمولی احتیاط عشق کا رد عمل ہیں ۔ ورنہ ان کے اشعار میں ایسی وارفتگی اور بے خودی کی کیفیت کس طرح ملتی ؎

نہ چھیڑ اے ہم نشیں کیفیت صہبا کے افسانے
شراب بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

یوں تو جگر کو محبوب کا شاعر کہا جاتا ہے لیکن حسرت کا کلام بھی محبوب کے تذکرے سے خالی نہیں ہے ۔ جگر کی طرح حسرت بھی محبوب کے دل کے نہاں خانوں کی خبر رکھتے تھے اور جو اس پر گزرتی ہے اس کو بھی رقم کرتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ایک پوری غزل جذبات محبوب کی ترجمانی کی نذر کی ہے جس کا مطلع ہے ؎

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے

یہ اور اسی قبیل کے بیشتر اشعار یوسف صاحب کی نظر میں ان کے تحت الشعور کی کیفیتوں کا رد عمل ہیں ۔

کلام حسرت میں غزل کے موضوعات کا جو تنوع ملتا ہے وہ کسی بھی ناقد کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ آخر حسرت کا شاعرانہ مسلک کیا ہے ؟ ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنے تنقیدی جائزے میں حسرت کے شاعرانہ مسلک کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے

کارنامہ "فرانسیسی ادب" ہے جس میں انہوں نے
موضوع سے متعلق تمام ضروری حقائق اس خوب
صورتی سے جمع کر دیئے ہیں کہ یوروپی اور مغربی
ادب کی اہم تحریکات اور رجحانات کا ایک نقشہ
مرتب ہو گیا ہے ــــــــــ جدید اردو ادب کے
شیداؤں اور ناقدوں دونوں کے لیے اس کتاب کا
مطالعہ بے حد مفید ہوگا(۱)

فرانسیسی ادب پانچ سو پچھتر (۵۷۵) صفحات پر مشتمل ہے جو حسب ذیل سولہ ابواب میں منقسم ہے۔اس کتاب کو انجمن ترقی اردو ہند (علی گڈھ) نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔

پہلا باب "قرون وسطیٰ میں فرانسیسی ادب کی ابتداء
دوسرا باب "نشاۃ ثانیہ اور اصلاح مذہبی کی تحریک کا اثر"
تیسرا باب "کلاسیکی ادب کی ابتداء
پانچواں باب "اٹھارویں صدی کا اصلاحی اور انقلابی دور"
چھٹا باب "رومانیت"
ساتواں باب "انیسویں صدی میں ناول کا ارتقاء"
آٹھواں باب "فطرت نگاری کے خلاف ردِ عمل"
نواں باب "انیسویں صدی میں تنقید نگاری"
دسواں باب "پارناس کا دبستانِ شاعری"
گیارھواں باب "رمزیت کا دبستانِ شاعری"
بارھواں باب "بیسویں صدی میں شاعری کے مختلف رجحانات"
تیرھواں باب "جدید ڈراما"

چودھواں باب "جدید ناول"

پندرھواں باب "سارتر اور مارسل کی وجودیت"

سولھواں باب "فرانسیسی ادب کی خصوصیات"

اپنی اس تصنیف کے دیباچے میں یوسف صاحب نے فرانسیسی ادب سے متعارت کرواتے ہوئے لکھا ہے۔۔۔۔

"چونکہ اردو زبان میں اس موضوع پر کوئی کتاب موجود نہیں تھی اس لیے اس کام کی تکمیل کا حوصلہ ہوا۔ امید ہے کہ اردو پڑھنے والوں کو فرانسیسی ادب کو سمجھنے میں اس کتاب سے تھوڑی بہت مدد ملے گی۔"(۲)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے اس اقتباس سے ہی پتہ چلتا ہے کہ ان کی کتاب فرانسیسی ادب ایک تاریخ یا تذکرہ ہی نہیں ہے بلکہ انہوں نے فرانسیسی ادب کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا ہے جس میں انہوں نے فرانسیسی زبان کی ابتداء سے لیکر بیسویں صدی تک تمام اصناف ادب کو ان کے تاریخی، سماجی اور معاشرتی ماحول میں سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ شاعروں، ادیبوں، نثرنگاروں، ڈرامہ نویسوں کے مختصر حالات زندگی اور ان کی تصانیف پر جو اثر ہے اس کا تجزیہ کیا ہے۔ تاریخی ماحول کی تبدیلیوں کے ساتھ جو فرانسیسی ادب میں نظر آتا ہے اس کا نہایت گہرا اور تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے فرانسیسی ادب کے مختلف ادوار میں منفرد ادیبوں کے ذہنی سفر کا عہد بہ عہد جائزہ لیا ہے۔ کہیں کہیں ان کا موازنہ بھی کیا ہے۔ مذہب کے زیر اثر فرانسیسی ادب کی مختلف اصناف ادب کی تبدیلیوں کا تجزیہ بھی کیا ہے۔

"فرانسیسی ادب" کے پہلے باب کا عنوان "قرون وسطیٰ میں فرانسیسی ادب کی ابتدا" ہے۔ جس میں انہوں نے قرون وسطیٰ میں فرانسیسی زبان اور ادب کے آغاز،

وہاں کے ماحول، تاریخ کے مختلف موڑ اور جغرافیائی اثرات سے بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ پانچویں صدی عیسوی میں فرانس میں رائج گالو رومن کی ہئیت میں تبدیلی پیدا ہوئی اور فرانسیسی زبان وجود میں آئی۔ گالو رومن جو کہ ایک زبان تو تھی مگر علمی اور کلاسیکی لاطینی سے مختلف تھی۔(۳)

گالو رومن مختلف علاقوں میں جغرافیائی اور نسلی اختلافات کی بنا پر الگ الگ بولیوں کی شکل اختیار کر گئی۔ قرون وسطیٰ میں ان سب بولیوں میں عوامی ادب ملتا ہے۔ گیارھویں صدی میں رزمیہ گیت ملتے ہیں جو گرداں قوال گایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں۔

"سب سے قدیم اور مقبول روماں کا گیت
CHANSON DE ROLAND ہے اس میں
شہنشاہ شارلی ماں اور عربوں کی لڑائی کا حال بیان
کیا گیا ہے۔ اس گیت کی فضا۔ گیارھویں صدی کی
فرانسیسی زندگی کی فضا۔ ہے"(۴)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں دوسری رزمیہ نظموں کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان نظموں، میں جو ادب ملتا ہے اس میں سورماؤں اور جواں مردوں کے کارناموں کا تذکرہ ہے۔ فرانس کی نثرنگاری کی ابتدا۔ تیرھویں صدی عیسوی سے ہوئی۔

"فتح قسطنطنیہ" ــــــــــــــــــــ فرانسیسی
زبان کی تاریخ کا پہلا نمونہ ہے"(۵)

قرون وسطیٰ میں ڈرامے کی نوعیت مذہبی تھی۔ ڈراما کے موضوع زیادہ تر مسیحی مذہب سے ماخوذ تھے۔ عوام جمالیاتی لطف بھی مذہب ہی سے اٹھاتے تھے۔ اہل کلیسا نے مذہبی عقیدت کو زندہ رکھنے کے لیے ایسے ڈراموں کو فروغ دیا جن کا مقصد عوام کو مثالی انداز میں اخلاقی خوبیوں کا درس دینا تھا۔ یوسف صاحب نے اس

زمانے کی ڈرامہ کی قسمیں بھی بیان کی ہیں۔

چودھویں اور پندرھویں صدی کی سیاسی ابتری اور جبر و تشدد سے اہل فرانس میں قومی جذبہ بیدار ہوا۔ جب سیاسی تبدیلی آتی ہے تو ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ادب نے بھی کروٹ بدلی اور مطلق شاہی اور متوسط طبقے نے انسانیت کی نئی قدروں کو رواج دیا چنانچہ اس ادب کے بارے میں یوسف صاحب لکھتے ہیں۔

"قرون وسطیٰ کے ادب میں مہم جوئی، اخلاقی نصائح اور طنز و ظرافت کی طرف توجہ کی گئی لیکن آئندہ صدیوں کے ادب میں طرز اسلوب کو سب سے زیادہ مقدم خیال کیا گیا"۔(۶)

یوں تو مواد اور اسلوب دونوں کی اہمیت ہے لیکن فرانسیسی ادب میں اسلوب کی واضح اہمیت رہی ہے۔ "فرانسیسی ادب" کا دوسرا باب نشاۃ ثانیہ اور اصلاح مذہبی کی تحریک کا اثر" ہے۔ جس میں انہوں نے نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا آغاز اور اس کا مقصد بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نشاہ ثانیہ کی تحریک پندرھویں صدی کے اواخر میں اٹلی کے ادب اور آرٹ کی ایک تحریک تھی۔ اس تحریک کا مقصد یونان و روما کے ادب کو از سر نو زندہ کرنا تھا تاکہ اس کے ذریعے زندگی کی نئی بصیرت حاصل کی جائے۔ اس تحریک کا سب سے بڑا نمائندہ پیٹرارک کو مانا جاتا ہے۔ پیٹرارک کے شاگرد اطالوی زبان کے ادب کو نئے خیالات سے مالا مال کر رہے تھے اور قدیم علوم و فنون کے زیر اثر انسانی فطرت اور عقل پر اعتماد کا پرچار کر رہے تھے۔ ان کی تعلیم تھی کہ جسم اور روح دونوں اپنا اپنا حق رکھتے ہیں جو انہیں ملنا چاہئے۔ رفتہ رفتہ یہ صدائے بازگشت یورپ کے دوسرے حصوں میں بھی سنائی دینے لگی۔"(۷)

یوسف صاحب نے ایک محقق، مؤرخ اور نقاد کی حیثیت سے تاریخی حالات کی روشنی میں اس دور کے بعض مشہور نثرنگاروں اور شاعروں کی اہم تصانیف کا ذکر

وہ لکھتے ہیں کہ ان کا شاعرانہ مسلک اپنے عہد کے تقاضوں اور خود ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے ہم آہنگ رہا ہے۔یوں تو حسرت کی ساری زندگی قید و بند اور دنیا کی مصیبتوں کا سامنا کرنے میں گزری لیکن ان کے کلیات میں کہیں بھی زندگی کے حقائق کی تلخی نظر نہیں آئے گی۔اس سے نہ صرف ان کے قلب کی وسعت ظاہر ہوتی ہے بلکہ اس کے ساتھ انسانیت اور زندگی کے امکانات پر ان کے اعتماد کا بھی اظہار ہوتا ہے۔بعض غزلوں میں اپنے اصلی رنگ غزل سے ہٹ کر سیاسی امور کی نسبت اشارے ملتے ہیں۔لیکن ان اشعار سے حسرت کے شاعرانہ مسلک، مزاج یا رنگ کو متعین نہیں کیا جاسکتا۔ان کا اصل رنگ تو حسن و عشق کے افسانے میں ظاہر ہوتا ہے یوں تو انھوں نے اپنا تخلص حسرت اختیار کیا لیکن ان کے کلام میں شاید ہی کہیں حسرت و یاس کا جذبہ ملتا ہے۔بلکہ ان کا پورا کلام ان کے خیال کی رعنائی بیان کی شوخی شستگی اور شگفتگی سے معمور ہے(۵) اور یہی اس دور کی جدید شاعری کا قیمتی سرمایہ ہے وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ حسرت کا پورا کلام ان کی شخصیت کی طرح والہانہ سرخوشی اور بے خودی کی کیفیت میں ڈوبا ہوا ہے۔اس میں غالب اور اقبال کی سی فلسفیانہ آگہی نہ سہی اور خود حسرت بھی فکر و نظر کے دعویدار نہیں رہے انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے حسن و عشق کی داستان بیان کی اور خوب بیان کی۔چاہے زمانہ کوئی رنگ اختیار کرے یہ داستان کبھی پرانی نہیں ہوگی۔اسے بیان کرنے والے اپنے اپنے رنگ و انداز میں اسے ہمیشہ بیان کرتے رہیں گے اور تہذیب رسم عاشقی کے قدر دان ان سے بصیرت حاصل کرتے رہیں گے۔

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ کیوں نہ خوبی قسمت پہ اپنی ناز کرے
دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

اس تنقیدی جائزے کے بعد اس کتاب کا نصف حصہ حسرت کے منتخب کلام پر مشتمل ہے۔

حوالے

---

(۱) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ حسرت کی شاعری ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۴۲۔
(۲) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ حسرت کی شاعری ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۴۳۔
(۳) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ حسرت کی شاعری ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۲۵۔
(۴) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ حسرت کی شاعری ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۲۷۔
(۵)

رعنائیِ خیال کو ٹھیرادیا گناہ
ظاہر بھی کس قدر ہے مذاق سخن سے دور

فرانسیسی ادب

عام طور سے اردو سے ناواقف حلقوں میں عرصہ سے یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ اردو صرف عشق و عاشقی اور غزل سرائی کی زبان ہے۔اس میں شک نہیں کہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے تصانیف کے جو انبار لگائے ہیں وہ زیادہ تر غم دوراں اور غم جاناں کی داستانوں کی حکایت و شکایت بیان کرتے ہیں۔لیکن ٹھوس عملی اور فکری کارناموں اور معلوماتی کتابوں پر جو دقت طلب محنت کا ثبوت دیا گیا ہے اس کے مقابلے میں ہندوستان کی دوسری جدید زبانوں کا دامن ہنوز خالی ہے۔اس لیے یہ کہنا مناسب ہوتا کہ سنجیدہ موضوعات پر اردو میں کتابیں کمیاب ہی نایاب نہیں ہیں۔ مولوی عبدالحق کے دور میں انجمن ترقی اردو ہند میں جو کام ہوا ہے صرف اسی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ تحقیق، تاریخ اور تنقید ہر صنف میں کام ہوا ہے اور قابل قدر وقیع کام ہوا ہے۔

اردو والے جس طرح عربی اور فارسی ادب عالیہ سے واقف رہے اور ان کی اعلیٰ روایات کو اپنی زبان میں کامیابی سے آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔اسی

طرح دوسری زبانوں سے بھی استفادہ کیا۔ کالی داس کی شکنتلا (اختر حسین رائے پوری) وکرم اروشی (عزیز مرزا) ابو ریحان البیرونی کی الہند اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ صرف ماضی کی بازیابی انہوں نے کافی نہیں سمجھی بلکہ مغرب کے اثرات کو قبول بھی کیا اور ان پر تفصیلی مواد مطالعہ کے لیے اردو والوں کے سامنے پیش کیا۔ اسی سلسلے میں محمد مجیب کی کتاب "روسی ادب" اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی "فرانسیسی ادب" کا نام ثبوت کے لیے کافی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت محض اس لیے نہیں کہ یہ ہمیں فرانسیسی ادب کی تاریخی داستان سناتی ہے بلکہ اس لیے بھی ہے کہ فرانس کی تہذیب اور ادب نے پورے یورپ کی زبانوں کے لیے مثال اور معیار کا کام کیا ہے۔ یورپ کے بعد امریکہ بھی اس کی برتری کا قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک عرصے تک فنون لطیفہ کے ہر رسیا کو فرانس میں کچھ عرصہ گزارنے اور استفادہ کرنے کی سند حاصل کرنی پڑی ہے۔ اردو والے خاص طور پر بیسویں صدی کے ادیب و شعرا۔ بعض راست اور زیادہ تر انگریزی کی وساطت سے فرانسیسی ادب، ادیبوں اور تحریکات سے متاثر ہوتے رہے۔ جن کی واضح چھاپ ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں فرانسیسی زبان اور ادب سے عالمانہ واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے پیرس کے زمانہ قیام میں اس زبان و ادب کا گہرا اور تنقیدی مطالعہ کیا تھا۔ اس مطالعہ سے جو علم ان کو حاصل ہوا اس کا فائدہ اردو ادب کو اس طرح پہنچا کہ اردو کے تنقیدی ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ چنانچہ فرانسیسی ادب ان کا ایک شاندار علمی کارنامہ ہے۔ جس میں انہوں نے موضوع سے متعلق تمام ضروری حقائق کو انتہائی عالمانہ اور محققانہ انداز میں یکجا کر دیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی نے فرانسیسی ادب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا ہے۔

"میرے خیال میں یوسف حسین خاں کا شاندار علمی

لیا ہے۔

کلاسیکیت کے اصول کی روشنی میں فن ڈراما اور شاعری کے تنقیدی جائزے میں وہ کہتے ہیں کہ ہر بڑے ادیب، ڈراما نویس اور شاعروں نے کلاسیکی اصولوں کو اپنی تصانیف میں برتا ہے۔ جس میں سب سے اہم بوالو Boileau ہے اس نے کہا ہے کہ صرف وہی چیز حسین ہو سکتی ہے جس میں صداقت ہو۔ اگر آرٹ مسرت کی تخلیق نہیں کر سکتا تو وہ ناقص ہے۔ مسرت صرف اس بات سے ملے گی جو فطری ہو۔ وہ کہتا ہے کہ ہر ادیب کا فرض ہے کہ وہ صفائی صحت اور نظم و نفاست کو اپنے پیش نظر رکھے اسے چاہیئے کہ وہ تخیل کی روک تھام کرے تاکہ ندرت، انوکھے پن کا روپ نہ اختیار کرے۔ اس نے تکلف اور تصنع کی مخالفت کی ہے لیکن وہ قدما کے مطالعہ پر زور دیتا ہے تاکہ راہ ادب روشن ہو سکے۔(۱۴)

کلاسیکیت میں ادب کو زندگی سے بالکل بے تعلق نہیں رکھا جاتا۔ یہ ضروری مانا گیا کہ قدیم ادب سے جو کچھ مستعار لیا جائے وہ محض تقلید نہ ہو تاکہ وہ فرانسیسی عصری زندگی سے بالکل بے تعلق نہ ہو۔ سترھویں صدی کے ادب میں انسان کی نفسیاتی اور اخلاقی زندگی کی طرف خاص توجہ کی گئی اور ڈراما میں اس دور کے اصولوں کی سختی سے پابندی کی گئی جس میں زماں، مکاں اور عمل شامل تھا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کلاسیکی ادیبوں کی تصانیف کے بارے میں کہتے ہیں:۔

"کلاسیکی ادیبوں نے فرانسیسی زبان کو نئے مزاج،
نئے آہنگ اور نئی فضاء سے آشنا کیا اور یہ زبان
پوری مغربی تہذیب کے اظہار کا وسیلہ بن گئی۔

(۱۵)

ان ہی خصوصیات کی بناء پر یہ دور کلاسیکی ادب کا عہد زریں کہلاتا ہے جس میں سترھویں صدی کے فرانس کا معاشرہ جیتی جاگتی شکل میں ہماری نظروں کے سامنے

آجاتا ہے۔

"فرانسیسی ادب" کے پانچواں باب میں "اٹھارویں صدی کے اصلاحی اور انقلابی ادب" کا تنقیدی جائزہ ملتا ہے۔یوسف حسین خاں کی نظر میں اٹھارویں صدی کا ادب اس لحاظ سے اصلاحی اور انقلابی ادب قرار پاتا ہے کہ یہ ساری مہذب دنیا کی ترجمانی کرتا ہے۔اسی کی وجہ سے فرانس میں معاشرتی اور سیاسی انقلاب آیا جس نے نہ صرف فرانس کی بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں کی بھی کایا پلٹ دی۔ فرانس میں سترھویں اور اٹھارویں صدی کے عام رجحانات میں بڑا فرق محسوس ہوتا ہے۔ سترھویں صدی میں سیاست بادشاہ کی ذات سے وابستہ تھی۔اٹھارویں صدی میں انقلاب کے ساتھ ہی ادب میں بھی انقلاب آیا۔یہ ادب مقصدی ادب تھا۔انسان کی اصلاح اس کا نظریہ تھا۔سترھویں صدی کے ادب میں فرد پیش نظر تھا اور اٹھارویں صدی کے ادب میں جماعت پیش نظر رہی۔فرانس کی اس اصلاحی اور انقلابی تحریک پر انگریز فلسفی لاک کے خیالات بھی اثر انداز رہے ہیں۔اس صدی میں شاعروں کی سرپرستی نہیں ہوئی اس لیے کوئی بڑا شاعر نہیں ملتا۔(۱۶)

سترھویں صدی کے آخری زمانے میں فرانس میں قدیم ادب کے حامیوں اور جدت پسندوں میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا، اعلیٰ درجے کے ادیب دو گروہوں میں بٹ گئے اور جیت جدت پسندوں کی ہوئی۔زمانے نے ان کا ساتھ دیا اور ان کا نقطہ نظر قبول کیا گیا اب ادب میں ہیئت کے مقابلے میں تصورات اور ان کی افادیت کو زیادہ اہم سمجھا جانے لگا۔انقلابی ادب نے تو کلاسیکی قواعد کو بالکل ہی نظرانداز کر کے نشر و اشاعت کو اپنا مقصد قرار دیا۔جدت پسندی کی تحریک کی وجہ سے یونانی اور لاطینی کے مقابلے میں فرانسیسی زبان پر زیادہ اعتماد کا اظہار ہونے لگا۔اٹھارویں صدی میں تو متوسط طبقے نے سارے مغربی یورپ میں اور خاص طور پر انگلستان اور فرانس میں غیر معمولی اثر اور رسوخ حاصل کر لیا تھا۔اس باب میں یوسف صاحب نے موتیسکیو،

والتیر Voltaire دیدرو Diderot ژاں ژاک روسو کی تصانیف کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

موتیسکیو کی تنقید کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:۔

"وہ یہ ثابت کرتی ہے کہ ہر تہذیب اضافی نوعیت رکھتی ہے۔ وہ (موتیسکیو) انفرادی برائیوں سے زیادہ اداروں کی کوتاہیوں کو واضح کرتا ہے۔"

(۱۷)

والتیر بیک وقت مؤرخ شاعر اور نقاد بھی تھا اس کے بارے میں یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ اس نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اس کی تصانیف کو شاعری، ڈارما، تاریخ اور قصص میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس نے مذہبی اداروں پر چوٹیں کی ہیں اور انہیں اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کے ڈرامے المسیہ میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ اس کے طرز تحریر میں صحت اور سادگی بدرجہ اتم موجود ہیں (۱۸)

دیدرو Diderot کے بارے میں یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ قاموس (انسائکلوپیڈیا) کی تیاری اس کا بڑا علمی کارنامہ ہے (۱۹)

ژاں ژاک روسو جو عالمی ادب میں بھی اہم مقام رکھتا ہے اس کی شخصیت اور فن کے تنقیدی جائزے میں یوسف صاحب رقمطراز ہیں کہ وہ علمی و ادبی حلقوں میں پہلے پہل موسیقار کی حیثیت سے متعارف ہوا بعد ازاں ادیب کی حیثیت سے۔ اس کے مشہور ناولوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"روسو کو اس کا پوری طرح سے احساس تھا کہ جب تک فرد کی اصلاح نہ ہو جماعت کی اصلاح ممکن نہیں۔" (۲۰)

روسو نے اپنی ادبی نگارشات میں جذباتی زندگی کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور

فرانسیسی ادب کو فصاحت، بلاغت، حقیقت اور غنائیت بخشی ۔وہ ادیب ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کا خطیب بھی تھا۔اس نے فطرت کے ساتھ انسانوں کا جذباتی تعلق قائم کیا۔فرانسیسی رومانیت پسند اور حقیقت پسند دونوں اسے اپنا امام مانتے ہیں جس کا اثر بیسویں صدی عیسوی کے تحت شعوری نفسیات میں بھی پایا جاتا ہے ۔اس انقلاب کے بعد متوسط طبقے کا زور بڑھا اور عوام بھی صدیوں کی نیند سے بیدار ہوئے ۔ نپولین نے اس بیداری کو اپنے شاہی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔" (۲۱)

"فرانسیسی ادب" کے چھٹے باب کا عنوان "رومانیت" ہے ۔کلاسیکی ادب کے رد عمل کے طور پر رومانیت نے جنم لیا۔یعنی انفرادیت پسندی، آزادی، فطرت اور انسان سے محبت اور جذبہ کی قدر افزائی ۔فرانسیسی ادب کی تاریخ میں روسو کا مقصد کلاسیکی ادب کے خلاف انقلاب پیدا کرنا تھا تاکہ ادبی تخلیق نقالی نہ رہے بلکہ اپج کا نتیجہ ہو جائے ۔انیسویں صدی کے ابتدائی پچاس سالوں میں رومانیت فرانس میں سب سے اہم ادبی تحریک بن گئی۔رومانی تحریک میں غنائی ادب کو نشو و نما پانے کا موقع ملا ایک طرح سے رومانیت کلاسیکی ادب کی تکمیل ہے ۔فرانس میں رومانیت کے بانی مادام دے اسٹیل Madame De Stael اور شانو بریاں کو مانا جاتا ہے ۔ یوسف صاحب کہتے ہیں کہ مادام دے اسٹیل کی دو تصانیف "ادب" Laliterature اور المانیہ L Allemague قدامت پسندی اور انقلابی خیالات کا عجیب و غریب مجموعہ ہیں ۔"ادب" میں اس نے بتایا کہ ادب پر معاشری احوال کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور پھر خود ادب کس طرح معاشرت میں تبدیلیاں پیدا کرنے کا آلہ کار بن جاتا ہے۔

اپنی دوسری تصنیف "المانیہ" میں اس نے جرمن لوگوں کے فلسفے، ادب اور شاعری پر بحث کرتے ہوئے جرمن قوم کی بڑی تعریف کی تھی ۔وہ چاہتی تھی کہ فرانسیسی ادب جرمن ادب سے قوت اور تازگی مستعار لے تاکہ اس کی رگوں میں

کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"کالوں کی تصنیف فرانسیسی نثر کی تاریخ میں اپنے
زور بیان و بلاغت اور قوت استدلال کی بناء پر
نہایت اہم ہے۔" (۸)

فرانسیسی ادب میں جو تبدیلی آئی اس میں مذہب کے بجائے زندگی کو اہمیت دی گئی اور مذہب بجائے رسمی چیز ہونے کے زندگی کا اصلی سرچشمہ بنا۔ ادب کی جو اقسام اور ہئیت قرون وسطیٰ میں رائج تھیں وہ بدلنے لگیں اسی لیے سولھویں صدی کے فرانسیسی ادب میں ہمیں قدم قدم پر تضاد نظر آتے ہیں۔ ایک طرف نشاۃ ثانیہ کے فطرت اور عقل کے تصورات ہیں اور دوسری طرف مسیحی عقائد کے پائدار اثرات، ایک طرف علم اور منطق ہے اور دوسری طرف عقیدت، ایک طرف عالمگیریت کا تصور ہے تو دوسری طرف قومیت کا نو خیز احساس۔ ان حالات میں ادب میں بھی تبدیلی آنا لازمی تھا۔ اس لیے یوسف صاحب نے سولھویں صدی کے ان حالات کے پیش نظر اس صدی کو انقلاب اور طلاطم کی صدی کہا ہے۔ (۹)

اس باب میں اس دور کی شاعری پر اجمالی تبصرہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اس دور کے مخصوص رجحانات اور شاعروں کے افکار سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نشاۃ ثانیہ نے انسان اور عالم کا جو تصور پیش کیا تھا اس کا اظہار فرانسیسی ادب میں بھی ہوا۔ انہوں نے اس دور کے چند مشہور شاعروں کلیماں مارو -- Marot ، لوئز لابے LOVISE LABE رونسار ، RONSARD آگرپادوبینے AGRIPPA DAU BIGNE کی شاعری کا تذکرہ کیا ہے۔ نثرنگاروں میں رابیلے RABELAIS موتینMONATAIGUE جیسے مشہور نثرنگاروں اور مضمون نگار کے فن کا بھی جائزہ لیا ہے۔

اس دور کے مشہور شاعروں کی شاعری کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے

انہوں نے اس صدی میں شاعری کو ترقی دینے کے لیے جو مقاصد تھے اس کو بھی ضبط تحریر میں لایا ہے۔ نثر نگار رابیلے RABELAIS کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ رابیلے RABELAIS نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا نثر نگار تھا۔ جس کی تحریر میں جوش حیات، زندہ دلی اور بزم خیال کی رنگا رنگی ملتی ہے وہ سولھویں صدی کا سب سے بڑا قصہ گو ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اس کے قصوں کے کرداروں کی تفصیل بھی بیان کی ہے وہ لکھتے ہیں ـــــ

"رابیلے کے پیش نظر ایسا انسان ہے جسے نشاۃ ثانیہ
کی تخلیق کہنا چاہیئے۔(۱۰)

اس دور سے ہی مضمون نگاری کی ابتدا ہوئی۔ موتتین MONTAIUNE کو مضمون نگاری یا "ایسے" کا بانی مانا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں یوسف صاحب کہتے ہیں کہ اس نے اپنے مضمونوں کے ذریعے ہمت اور جرأت کی تلقین کی ہے۔ اس کے پاس عمل بامعنی چیز ہے وہ عقل کو اہم مانتا ہے اور عقل کے حدود مقرر کرتا ہے۔ چنانچہ خود اس نے اپنی اندرونی زندگی کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی اس لیے کہ وہ انسان کی تصویر ہے وہ لکھتے ہیں کہ موتتین کے پاس ــ

"ہر انسان کے اندر پوری انسانی فطرت کی شکل
موجود ہے"۔(۱۱)

اس نے ادیبوں کی بڑی تعداد کو متاثر کیا۔

"فرانسیسی ادب" کے تیسرے اور چوتھے باب میں یوسف صاحب نے کلاسیکی ادب کی ابتدا۔" اور "کلاسیکی ادب کا عہد زریں" کے عنوانات کے تحت مالرب MALHERCE رے نیئے REGNIER MATTHURIN کورنئ CORNEILLE دیکارت DESCARTES پاسکال، بوالو BOILEAU مولیر MOLIERE راسین RACINE ، لافونشین، بوسوئے BOSSNET فینلوں

FENELON لاروش فوکو LA ROCHEFOUCAULD لابرویر LABRUYERE کے حالات زندگی کو بیان کرتے ہوئے ان کی تصانیف کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

ہر دور نے اپنے ادب میں اس زمانے کے ذوق کی عکاسی کی ہے کبھی تو ادب نے کلاسیکیت کو اپنایا تو کبھی رومانیت کو۔اسی طرح فرانس میں سیاسی ابتری کے بعد ادب میں بھی ایک نیا موڑ آیا۔اسی زمانے میں مالرب MAHERCE نے اپنی شاعری کے ذریعے نئے دبستان سخن کی بنا ڈالی اس سے فرانس میں کلاسیکی ادب کی ابتداء ہوئی۔مالرب نے عروض کے قواعد مقرر کئے۔یوسف صاحب رونسار کے کلاسیکی ادبی اصول کے تعلق سے لکھتے ہیں۔۔۔۔

> "اس کا خیال تھا کہ قدیم ادب کی دیومالا کو بلا انتخاب فرانسیسی ادب میں ٹھونسنے سے کوئی فائدہ نہیں۔جہاں تک ہوسکے اس دیومالا کو کم سے کم برتنا چاہیے تاکہ فرانسیسی ادب کی خصوصیات ماند نہ پڑجائیں۔شاعری میں موضوع ایسے منتخب کرنے چاہئیں جن سے عام طور پر لوگ روشناس ہوں وہ اپنے شاگردوں سے کہتا تھا کہ شاعری ریاضت ہے۔
>
> (۱۴)

راں بوئے کے دیوان خانے کو فرانسیسی زبان کی سترھویں صدی کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔اس سے فرانسیسی اکیڈیمی کی داغ بیل پڑی۔جہاں امراء بھی معمولی حیثیت کے ادیبوں اور فنکاروں کے ساتھ بے تکلفی اور برابری سے ملتے تھے ادب کے علاوہ رقص و موسیقی اور ڈراما کی بھی یہاں سرپرستی اور قدر افزائی کی جاتی تھی۔

دیکارت DESCARTES سترھویں صدی کا مشہور فلسفی اور طبیعیات اور ریاضی کا ماہر تھا۔اس کے خیالات نے سترھیوں صدی اور اٹھارویں صدی کے ادب پر گہرا اثر ڈالااور اس لیے یوسف صاحب نے اس کا جائزہ لیناضروری سمجھا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ دیکارت کے اصول تحقیق نے صحیح معنوں میں ایک انقلابی فکر کی بناڈالی۔اس کا کہنا ہے کہ بغیر ثبوت کے کسی بات کی صداقت کو نہیں ماننا چاہیئے۔ذاتی پسند اور ناپسند کا کوئی لحاظ نہیں کرنا چاہیئے۔حقیقت تک پہنچنے کے لیے واقعات کا تجزیہ ضروری ہے۔اپنے تصورات کو اس طرح سے مرتب کرنا چاہیئے کہ عام سے خاص کی طرف ذہن جائے۔تقسیم و درجہ بندی علم کے لیے ضروری ہے۔یہ اصول دیکارت کے عقلی فلسفے کی بنیادہیں جن کی مدد سے انسان صداقت تک پہنچ سکتا ہے۔فلسفیانہ موضوع پر دیکارت نے سب سے پہلے فرانسیسی زبان میں اظہار خیال کیا۔جو فرانس کی فضا میں موجود تھاایک منطقی نظام فکر کے طور پر پیش کیا(۱۳)

یوسف صاحب نے "کلاسیکی ادب کا عہد زرین" کے عنوان سے چوتھے باب میں تاریخی و سیاسی واقعات کی روشنی میں اس عہد کے مشہور نثرنگاروں، ڈرامانویس اور شاعروں کے تذکرے کے ساتھ ان کی تصانیف کی خصوصیت اور اہمیت کی بھی نشاندہی کی ہے۔

یوسف صاحب نے لکھا ہے کہ لوئی چودھویں کے عہد حکومت میں فرانس میں زندگی کے ہر شعبے میں چاہے وہ سیاست ہو یاادب ایک نیاابھار اور ایک نئی امنگ دکھائی دیتی ہے۔

انہوں نے اس عہد کے ادیبوں شاعروں اور ڈرامانگاروں کے تذکرے میں بوالو Boileau موئیر Moliere راسین Racine لافونتین بوسوے Bossonet فینلوں Fenelon لاروش خوکو La Rocheefoicaul اور لابرویر کے تذکرے میں تاریخی و سیاسی تبدیلی کے زیر اثر ان کے فلسفیانہ افکار کا جائزہ

بھی نیا خون دوڑنے لگے۔وہ جدید یورپ کی پہلی عورت ہے جس نے حقوق نسواں کا جھنڈا بلند کیا۔مادام دے اسٹیل کی حیثیت تاریخی ہے اس نے رومانیت کی نئی ادبی تحریک کے اثر کو فرانس میں سب سے پہلے محسوس کیا۔وہ روسو کے بعد آنے والے رومانی ادیبوں کے درمیاں ایک نشان منزل ہے۔(۲۲)

دور رومانیت کا ایک اہم نمائندہ وکٹر ھیو گو بھی ہے۔یوسف صاحب کہتے ہیں کہ وہ شانوبریاں کا بڑا مداح تھا۔سترہ سال کی عمر میں اس نے ادبی رسالہ " محافظ ادب Conservateve Litteraire نکالا۔

وکٹر ھیو گو نے کرامول کی تمہید Preface de Cramwels شائع کی اور اس کے بعد ہی وہ رومانی تحریک کا قائد سمجھا جانے لگا۔جلاوطنی کے اٹھارہ سالوں میں اس نے ہر صنف ادب پر طبع آزمائی کی اور اس کے سب شاہکار نظم ونثر دونوں ہی جلاوطنی کے زمانے کی یادگار ہیں۔وکٹر ھیو گو تقریباً ساٹھ سال تک فرانس میں رومانی تحریک کا سرگروہ رہا۔اس کے فنی کمال نے انیسویں صدی کی روح میں تازگی اور شگفتگی پیدا کی۔(۲۳)

یوسف صاحب وکٹر ھیو گو کی نظم، طنزیہ شاعری، داستاں پاستاں اور ڈراما کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خانگی زندگی کی برگزیدگی، وطن سے محبت، فطرت سے محبت، فلسفیانہ اور مذہبی مسائل جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اس نے ڈراموں میں ایسے کرداروں کے ذریعے اپنے رومانی خیالات پیش کیے۔

تیوفل گوئٹے Tehophile Gaulier بھی عالمی ادب کا نمایاں شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔گوئٹے اپنی ابتدائی زندگی میں مصور تھا بعد میں شاعر اور تنقید نگاری میں نام پیدا کیا۔وہ فن برائے فن کے نظریے کا حامی تھا۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں اس کی شاعری کے تعلق سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے نزدیک شاعری میں صرف ہئیت کو اہمیت حاصل ہے اس کے نزدیک اصل حقیقت حسن ہے۔اس کی شاعری نظر

کی شاعری ہے ۔وہ کئی لفظوں کے ذریعے تصویر کشی کرتا ہے ۔اس کے اسلوب کو حقیقت نگاری کی ابتدا۔ کہہ سکتے ہیں جو کلاسیکی ادیبوں کی خصوصیت تھی ۔ فرانسیسی ادب میں گوئٹے کا ایک خاص مقام ہے ۔وہ فرانسیسی ادب کو رومانیت کے " درون خانہ " سے حقیقت نگاری کے " برون در " لانے میں کامیاب ہوا ۔اس نے ادب میں حقیقت نگاری اور مقامی رنگ کی خصوصیت پر زور دیا جو رومانیت کا تحفہ تھا(۴۱)

" فرانسیسی ادب " کے ساتویں باب بہ عنوان " انیسویں صدی میں ناول کا ارتقاء " میں یوسف صاحب نے اشتراکیت کے زیر اثر فرانسیسی ادب میں تبدیلی کا جائزہ لیا ہے ۔ رومانی ادیبوں اور اشتراکی قائدین میں ایک بات مشترک تھی کہ دونوں کی قوت محرکہ جذبہ تھا نہ کہ افادہ ۔چنانچہ مشہور رومانی مفکروں جیسے ژورج ساں George sand اور بالزاک Balzac کے ہاں گہرا اشتراکی اثر نظر آتا ہے جس کا مقصد نچلے طبقے کی زندگی کو بہتر بنانا اور اس کے لیے ترقی کے مواقع بہم پہنچانا تھا ۔چنانچہ رومانی ناول نویسوں نے معاشری زندگی کی تصویر کشی کو اپنا مقصد قرار دیا ۔ انیسویں صدی کے شروع میں جو رومانی ناول لکھے گئے ان سب میں خارجی حقیقت سے زیادہ اندرونی جذبے کی حقیقت نمایاں نظر آتی ہے ۔انیسویں صدی کی ناول نگاری بامقصد تھی ۔ ھوگیو ژورج ساں اور اور بالزاک نے معاشری زندگی کو جس انداز میں پیش کیا اس کی تہ میں اصلاح کا محرک موجود تھا ۔اس دور کے تاریخی ناول بھی حقیقت نگاری کے حامل تھے ۔

اس باب میں یوسف صاحب نے آنرے دے بالزاک Blaze استاں دحال Stendhal گستاؤ فلوبیز Flaubert ، امیل زولا ، گی دے موپاسان ، ادیس مان ، الفونس دودے Alphonse Dandet جیسے مشہور ادیبوں و شاعروں کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے ۔

بلزاک کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں کہ اس کے ناول زیادہ تر مہم جوئی سے تعلق

رکھتے تھے ۔اس نے نہ صرف یورپ بلکہ ساری مہذب دنیا میں اپنا ادبی سکہ جمایا تھا۔ وہ حقیقت نگاری کا خالق تھا۔جس نے ابتدا رومانیت سے کی تھی لیکن اس کی شکل بدل دی رومانیت بھی کسی نہ کسی شکل میں اس کی تصانیف میں ملتی ہے ۔جس کا اظہار اس کے کرداروں کی سیرت سے ہوتا ہے جو معمول سے ہٹ کر ہیں ۔اس کے ہر ناول میں معاشری ، سیاسی یا اخلاقی خیالات قصے کے پیرائے میں پیش کیے گئے ہیں ۔ بالزاک کی بدولت فرانسیسی شاعری زندہ ہوئی اور فرانسیسی نثر میں انقلاب آیا۔

استاں دھال کے تذکرے میں یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ وہ ناول نگار کے ساتھ ساتھ تنقید نگار بھی تھا ۔وہ توانائی اور قوت ارادی کے مظاہر کو سراہتا تھا ۔ چاہے وہ شر کے ہوں یا خیر کے اس کا بنیادی خیال یہ ہے کہ حصول مسرت کی خواہش عمل کی سب سے بڑی محرک ہے ۔اس کے یہاں مطالب کی صحت کا بڑا خیال رکھا گیا ہے ۔(۲۵)

گستاؤ فلوبیر Flaubert کے تعلق سے یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ بلزاک کی حقیقت نگاری اور ناول نگاری کو آگے بڑھانے میں فلوبیر نے اہم رول ادا کیا ۔اس کی تصانیف میں رومانیت اور حقیقت نگاری پہلو بہ پہلو نظر آتی ہے لیکن مجموعی طور پر حقیقت نگاری کا پلہ بھاری ہے ۔

اس کے نزدیک آرٹ کا خالق انسان ہے جس طرح فطرت کا خالق خدا ہے ۔ اس نے نثر میں شاعری کی ہے ۔وہ واقعات کی صرف تصویر کشی کر کے نہیں چھوڑ دیتا وہ آرٹ کے ذریعے زندگی کا تاثر پیدا کرنا چاہتا ہے ۔وہ رومانی غنائیت کے بجائے مطلق اور بے تعلق خارجیت کی حمایت کرتا ہے ۔اس کی ناولوں کے ہر فقرے میں توازن اور آہنگ نمایاں ہے ۔اس کا آرٹ خواص کے لیے ہے ، عوام کے لیے نہیں ۔ اس کے فکر و فن کا مقصود و منتہا تخلیق حسن تھا جسے کوئی فن کار بغیر انتہائی ریاضت کے نہیں حاصل کر سکتا ۔(۲۶)

امیل زولا کے تعلق سے یوسف صاحب نے لکھا ہے کہ اس نے فطرت نگاری کے رجحان کو مستقل نظریہ بنا دیا۔ اس کے ساتھ موپاساں Maupassant اور اویس ماں Huymams بھی شامل تھے۔ ان سبھوں نے مل کر " میداں کی شامیں " Les Soireas De Medam شائع کی جس میں فطرت نگاری کے ادبی تجربہ کے ساتھ سیاست و معاشرت پر عام تنقیدیں بھی کی جاتیں تھیں۔ یوسف صاحب نے فطرت نگاری اور حقیقت نگاری پر اپنی تنقیدی رائے ظاہر کرتے ہوئے زولا کا ادبی نظریہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ زولا کے نظریے کے مطابق ناول نویس اپنے تجربے سے ان قوانین کی تصدیق کرتا ہے جو جبلی طور پر کرداروں کے عمل کو متعین کرتے ہیں۔ زولا نے ادب میں سائنٹفک عنصر کو داخل کرنے کا جو ادعا پیش کیا اس کی اصلیت مشتبہ ہے۔ اس نے توارث کے حیاتیاتی قانون کو اپنے ناولوں میں خاص مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس کے نزدیک جس طرح روح جسم کے تابع ہے، اس کے نزدیک اسی طرح اخلاق علم افعال اعضا۔ کے تحت وجود میں آتا ہے زولا کے کرداروں کے عمل میں جبریت حاوی ہے اس لیے اس کے فلسفے کے ڈانڈے ایک طرف قنوطیت اور یاس پسندی سے جا کر مل جاتے ہیں اور دوسری طرف حیوانیت سے۔ زولا نے صنعتی زندگی کے بعض مظاہر کو خاص طور پر اپنا موضوع بنایا۔ اس نے آرٹ کو پروپگنڈے کا ذریعہ بنا دیا۔ اصل میں وہ آرٹ سے زیادہ سائنٹفک طریق کار کی اہمیت کا قائل تھا جسے وہ ناول میں استعمال کرنا چاہتا تھا (۲۷)

گی دے موپاساں جسے افسانہ کا استاد مانا جاتا ہے، کوئی تین سو افسانے لکھے اس کے طرز تحریر کے تعلق سے یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ اس نے زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ اس کے کرداروں میں تنوع ملتا ہے۔ وہ اشخاص اور واقعات کی سچی عکاسی اپنے ناولوں اور افسانوں میں پیش کرتا تھا۔ اس کے افسانے سنجیدہ بھی ہیں

اور مزاحیہ بھی ۔اس کو زباں و بیان پر پوری قدرت حاصل تھی ۔وہ اپنے اسلوب کو فطری اقتضا سمجھتا تھا ۔(۲۸)

الفونس دودے Alphanse Daudet مشہور ناول نگار تھا جس کا انداز انگریزی ناول نویس ڈکنس سے مشابہ ہے ۔یوسف صاحب اس کی تصانیف کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس نے اپنے کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے ۔اسلوب بیاں کے لحاظ سے دودے کا مقام بہت بلند ہے ۔تحریر کی دلکشی بچوں اور بوڑھوں سب کو بھاتی ہے ۔اس کی زبان کی سادگی، سلاست اور سنجیدگی اسے اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے ۔اس کے یہاں طنزو مزاح کی لطیف چاشنی بھی ہے ۔(۲۹)

یوسف صاحب نے الگزنڈر اڈیوما اور امیل اوژنے Emile Augier کے ڈراموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "آزاد تھیٹر" کے قیام سے ڈراما میں حقیقت نگاری کا رواج بڑھا ۔(۳۰)

"فرانسیسی ادب" کے نویں باب کا عنوان "انیسویں صدی میں تنقید نگاری" ہے جس میں یوسف صاحب نے انیسویں صدی کے مختلف نقادوں کے نظریہ ٔ تنقید کا جائزہ لیا ہے ۔جس میں ابل فرانسوا ویل میں Abel Francois Ville Wain سینٹ بوو Sainte-Beuve اپولیت تین ، ارنسٹ ریناں Earnest Renan ژول مترJules le Maitre اور برونے تیر شامل ہیں ۔

اس باب میں یوسف صاحب انیسویں صدی میں فرانسیسی ادب میں تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رومانی آرٹ میں تنقید کے کوئی خاص ضابطے نہ تھے بلکہ اس کا انحصار ذاتی پسند اور ناپسند پر تھا ۔سب سے پہلے مادم ۔دے ۔استیل نے ادبی تخلیق کو پرکھنے کے لیے چند اصول وضع کیے اور تنقید کے بالکل نئے اصول کی بنا ڈالی ۔ہر زمانے کے سیاسی اور معاشی حالات سے ادب بھی متاثر ہوا ۔ادب کی ہر صنف میں مفکروں نے اپنے درد کی عکاسی کی ہے ۔اسی طرح سے تنقید بھی مختلف ادوار سے

گزری ۔ اور یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ادب کو بھی بدلتے ہوئے حالات کی ترجمانی کرنا چاہیئے ۔ (۳۱)

سنیت بوو Sainte Beuve رومانی نقاد تھا اسے تنقید کا امام کہا جاتا ہے یوسف صاحب نے اس کے تنقیدی اصولوں میں نفسیاتی تجزیے کی اہمیت بتائی ہے وہ لکھتے ہیں کہ سنیت بوو کسی کی جانبداری نہیں کرتا وہ صرف سمجھنا اور تشریح کرنا چاہتا تھا ۔ اس کا خیال ہے کہ ادیب اپنی تخلیق میں بنیادی طور پر آزاد ہے ۔ اس کے تنقیدی مضامین Lundis کے نام سے چھپے وہ ادیب کو فرد کی حیثیت سے دیکھتا پرکھتا تھا ۔ (۳۲)

اپولیت تین Taine فطرت نگاری کی تحریک کا فلسفی اور مفکر تھا ۔ اس نے ادبی تنقید کے اصول کو سائنٹفک انداز میں پیش کیا " فلسفے " ادب اور تاریخ پر اس کی نظر بہت گہری تھی ۔ یوسف صاحب نے لکھا ہے کہ تین Taine نے ثابت کیا کہ نفسی کیفیات کا تعلق جسمانی افعال سے ہے ۔ تین نے تنقید کے جو اصول مرتب کیے وہ اس کے فلسفیانہ خیالات سے ماخوذ تھے جن پر ہیگل اور اسپنوزا کا اثر نمایاں ہے وہ ادب کی تخلیقی حقیقت کو منطق کا پابند کرنا چاہتا تھا اس لیے اس کے یہاں اخلاقی اور جمالیاتی احساس کی کوئی حیثیت نہیں ۔ اس کے نزدیک انسانی صلاحیتوں کے ماخذ نسل ، ماحول اور زمانہ ہیں اس طرح تین نے تاریخ کو میکانکی علم کا جز بنا دیا ۔

ارنسٹ ریناں Earnest Renan ایک مورخ اور بلند درجہ کا نقاد تھا یوسف صاحب کہتے ہیں کہ وہ مافوق عناصر کی نفی کرتا ہے اور عقلی معیار کی مطابقت پر زور دیتا ہے ۔ تاریخ کے علاوہ اس نے فلسفیانہ موضوعات پر بھی لکھا ہے ۔ مورخ اور نقاد کی حیثیت سے ریناں نے اپنا موضوع مذہب کو قرار دیا ۔ اس نے ، خیر ، حسن اور صداقت پر زور دیا ۔ ریناں کا اسلوب نگارش سادہ ، سلجھا ہوا ، رواں ، صاف اور لچکیلا ہے ۔ اس میں موسیقیت کا رچاؤ موجود ہے ۔ اس کی تصانیف کو پڑھتے وقت افلاطون

کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔(۳۴)

فرانسیسی ادب کے آٹھواں باب کا عنوان "فطرت نگاری کے خلاف رد عمل" ہے۔

رومانی ناول نویسوں نے معاشری زندگی کی تصویر کشی کو اپنا مقصد قرار دیا تھا۔جس میں متوسط طبقے کے علاوہ نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی کو پیش کیا جاتا۔ آگے چل کر امیل زولا Zola نے فطرت نگاری کا نظریہ پیش کیا۔زولا کی فطرت نگاری میں مذہب و اخلاق سے بے زاری کا جو اظہار تھا اس کے خلاف بہت جلد رد عمل رونما ہوا۔مخالفوں نے زندگی کے کاروان کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے مذہب اور اخلاق کو ضروری قرار دیا ہے اور کہا کہ اسی کی بدولت انسانیت نیکی، حسن، محبت امید اور مسرت سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ سب سے پہلے پال بورژے Paul Bourget نے فطرت نگاری کے مقابلے میں نفسیاتی ناول پیش کیے جن میں ڈرامائی ٹیکنک کو سمونے کی کوشش کی۔

مورس بارس Maurice Barres بھی فطرت نگاری کے خلاف تھا۔وہ فرانس کی سوئی روایات اور اس کے گزشتہ وقار کو زندہ کرنا چاہتا تھا۔ بارس کے تعلق سے یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ اس کے نزدیک ادب اور آرٹ کا فرض ہے کہ خودی کی نشو نما میں مدد دیں اور اس احساس میں لطافت پیدا کریں۔

اناتول فرانس کو ادب کے علاوہ تاریخ، فلسفہ اور آثار قدیمہ سے لگاؤ تھا۔اور وہ ان مضامین کی کتابیں بھی پڑھتا تھا۔اناتول فرانس کے بارے میں یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ وہ تشکیک میں مبتلا تھا۔اس کو اگر یقین تھا تو اس بات کا تھا کہ انسانیت حسن کے ذریعہ مسرت حاصل کر سکتی ہے۔اس نے ادب میں حسن آفرینی کے مقصد کو اپنے پیش نظر رکھا۔اس نے کلاسیکی روایات کو نئے انداز سے پیش کیا جن میں نزاکت اور لطافت نمایاں تھی۔وہ ناول نویس ہونے کے علاوہ مفکر بھی تھا۔اس کے

زمانے میں فطرت نگاری اور رمزیت کی جو دو تحریکیں چل رہی تھیں اس نے اپنے آپ کو کسی سے بھی وابستہ نہیں کیا۔ وہ زندگی کو ہر رخ سے دیکھتا ہے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک طرف تو وہ کلاسیکی حکمت کا خوشہ چیں ہے اور دوسری طرف وہ جدید علوم و فنون پر گہری نظر رکھتا ہے۔ (۳۴)

اس کی مشہور زمانہ ناول "تائیس" کا مشہور مترجم عنایت اللہ نے اردو میں ترجمہ کیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ ہندی کی مشہور ناول "چترلیکھا" (بھگوتی چرن ورما) بھی اسی کا چربہ ہے۔ جس کی فلم اسی نام سے بنی تھی۔

مشہور افسانہ نگار غلام عباس نے اسی ناول کے ایک باب پر اپنے افسانے "آنندی" کی بنیاد رکھی ہے۔

"فرانسیسی ادب" کے دسویں اور گیارھویں باب میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے دو دبستانوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ دسواں باب "پارس کا دبستاں شاعری" اور گیارہواں باب "رمزیت کا دبستاں شاعری" ہے"۔

ان ابواب میں ان دبستانوں کی نمایاں خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان ابواب کے مطالعہ سے اس احساس کو اور تقویت ملتی ہے کہ یوسف صاحب کو شعری ادب کی رمزیت سے خاص شغف رہا ہے۔ اس میں انہوں نے دونوں دبستانوں کا موازنہ بھی کیا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں رومانیت پسند شاعروں میں سے بعض نے جذبہ نگاری کے بجائے لفظوں کی چھان بین اور ہئیت کی طرف خاص توجہ کی۔ رومانی شاعروں کے پسندیدہ موضوعات کو ان لوگوں نے ممنوع قرار دیا۔ انھوں نے فلسفیانہ خیالات کو تشبیہ و استعارہ سے پر تکلف طور پر آراستہ کیا اور لفظوں کی صحت پر بڑا زور دیا۔ تاکہ ان کی اندرونی مخفی توانائی جلوہ گر ہو۔ شاعر کی حیثیت بس ایک فنکار کی ہوتی ہے جو تشبیہ و استعارہ اور وزن و آہنگ سے حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ اس نظریئے

کو سب سے پہلے گوئٹے نے پیش کیا۔ گوئٹے جو کہ رومانیت سے تعلق رکھتا تھا مگر اس کی کوتاہیوں کو دور کرنے کے لیے اس نے فن برائے فن کا نظریہ پیش کیا۔ گوئٹے ایک مصور تھا اس نے اپنی شاعری میں لفظوں سے تصویر کشی کی ہے۔ اس کے نزدیک شاعری کا اصلی مقصد مصوری ہے اور شاعر کا فن حقیقت میں مصور کا فن ہے (۳۵) رمزنگاروں کی تحریک دراصل پارناسی شاعری کے خلاف رد عمل تھا۔ رمزنگاروں نے دروں بینی اور موسیقیت کے محرکات اپنی شاعری میں سموئے۔ رمز نگاری شاعروں کے خیال میں حقیقی شاعری میں تاثرات اور ان کے تلازموں کا اظہار ہونا چاہیئے۔ رمزنگاری کی شاعری میں ضروری نہیں کہ کوئی معنی یا مفہوم ہو۔

بودلیر Bandlaire رمزنگاری کا بانی ہے۔ استیفان مالارمے Mallarue کو رمزنگاری کی تحریک کا قائد کہا جاتا ہے اس نے رمزنگاری کے اصول مرتب کیے۔ اس کے نزدیک شاعری کا مقصد افلاطون کی طرح عینی عالم کو نمایاں کرنا ہے۔

" فرانسیسی ادب " کے تین ابواب یعنی بارھواں، تیرھواں اور چودھواں بیسویں صدی کے ادبی رجحانات اور مختلف ادبی موضوعات کے تفصیلی تجزیہ کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یوسف صاحب نے بارھویں باب میں " بیسویں صدی میں شاعری کے مختلف رجحان " تیرھویں باب میں " جدید ڈراما " اور چودھویں باب میں " جدید ناول " سے بحثیں کی ہیں۔ ان تینوں ابواب کا ایک ساتھ مطالعہ کرنے سے ہمیں بیسویں صدی میں شاعری ڈراما اور ناول کے عام رجحانات کے علاوہ یوسف صاحب کے وسیع ذوق مطالعہ اور تنقیدی شعور کا بھی سراغ ملتا ہے۔

شاعری کے مختلف رجحانات کی تفصیل یوسف صاحب نے بارھویں باب میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ رومانیت نے فطرت نگاری کی جگہ لی، فطرت نگاری نے رمزیت اور پھر رمزیت نے رومن دبستان کی جگہ لی جس نے کلاسیکی ادب کو دوبارہ زندہ کیا۔ اس باب میں انھوں نے فرانس ژام Francis Jammes ، شاول

پے گوئی ، اپولی تیر، اندرے بریتوں Andre Breton ، الوار اور آراگوں کی شاعری کا جائزہ لیا ہے ۔ بیسویں صدی کی فرانسیسی شاعری پر برگسوں ، امپریشن ازم کی تحریک ، کیوبزم کا اثر اور فرائڈ کے اثر کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں جس طرح اٹھارویں صدی عیسوی میں دیکارت کے عقلی فلسفے کا اس زمانے کے فرانسیسی ادب پر گہرا اثر پڑا اسی طرح بیسویں صدی کے ادب پر برگسوں کا نظریہ وجداں کا اثر نظر آتا ہے ۔ عقل کے بجائے اس نے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے وجدان کا نسخہ تجویز کیا ۔ بیسویں صدی کے شروع میں ادیبوں شاعروں اور فن کاروں نے یہ اثر قبول کیا اور تاثر پسندی کے دبستاں کو مقبولیت حاصل ہوئی ۔ ان کے نزدیک فن کار کو فطرت کی نقل کے ساتھ ساتھ اپنا تاثر واحساس بھی شامل کرنا ضروری تھا ۔ تاثر پسندی سے ملتی جلتی ایک اور تحریک کیوبزم جس کا بانی پکاسو تھا شروع ہوئی ۔ ان لوگوں نے اشکال کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی کیوبزم کی تحریک کا اثر ادب اور شاعری پر بھی نظر آتا ہے ۔ (۳۶)

پہلی جنگ عظیم کے بعد فرانس میں جو ناول نگار منظر عام پر آئے انھوں نے اظہار خیال کے لیے اپنے اپنے جداگانہ اسلوب وضع کیے ۔ ان میں مارسل پروست کا مقام سب سے زیادہ نمایاں اور بلند ہے ۔

مارسل پروست نے اپنے ناول " کھوئے ہوئے زمانے کی جستجو " میں نفسیاتی تجزیے کا بالکل ایک نیا انداز نظر اختیار کیا ہے ۔ اس نے اپنے ناولوں میں جدید انسان کے احساس کی ترجمانی کی ہے ۔

یہ دونوں باب اردو والوں کے لیے بے حد اہمیت رکھتے ہیں ۔ ترقی پسند تحریک کے بعد جدیدیت انھیں مغربی فن کاروں سے خیالات واسلوب مستعار لینے لگی رمزیت ، اشاریت ، ابہام اور غم ذات کے عنوان یہیں سے آئے ۔ اس لیے اس باب سے ہمیں ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جن کی روشنی میں جدیدیت کے علمبردار

ادیبوں اور شاعروں کو پرکھنا آسان ہو جاتا ہے۔

"فرانسیسی ادب" کا پندرھواں باب "سارتر مارسل کی وجودیت" کے عنوان سے ہے۔ جس میں انھوں نے ژاں پال سارتر اور گبریل مارسل کی تصانیف کا جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ژاں پال سارتر فرانس میں وجودیت کی تحریک کا قائد مانا جاتا ہے وجودیت ہر قسم کی نظام سازی کے خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان خود قدروں کا خالق ہے جو اضافی نوعیت رکھتی ہیں۔

فرانس میں وجودیت کی دو شاخیں ہو گئیں ایک کی نمایندگی سارتر کرتا ہے دوسری شاخ کی نمایندگی مارسل نے کی ہے۔ مارسل ذات باری، روحانیت اور اخلاق کا قائل ہے۔ وہ فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ ڈراما نگار بھی ہے جس نے جماعتی زندگی کی برکت کو اجاگر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ جب تک فرد اپنے اندرونی خول سے باہر نہیں نکلتا خود اس کی ذات کی تکمیل نہیں ہوتی۔ (۳۷)

یوسف صاحب نے اس تصنیف کے "سولھویں باب" یعنی اختتامی باب میں فرانسیسی ادب کی خصوصیات کا جامع انداز میں احاطہ کیا ہے اس باب میں ان تمام مختلف خیالات، نظریات اور خصوصیات کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی جن پر ڈاکٹر صاحب نے علحدہ علحدہ مستقل باب لکھا ہے۔ غرض اس گراں قدر تصنیف کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب نے اردو ادب میں عالمی ادب کے ایک پیش بہا ذخیرے کا اضافہ کیا ہے

حوالے

---

(۱) ڈاکٹر عبدالمغنی - یوسف حسین خان، عالم یا ناقد، ہماری زبان صفحہ (۶)
(۲) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، دیباچہ
(۳) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۲)
(۴) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، صفحہ (۴)
(۵) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، صفحہ (۱۳)
(۶) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، صفحہ (۲۲)
(۷) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۲۴-۲۳)
(۸) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، صفحہ (۳۰)
(۹) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۳۴)
(۱۰) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، صفحہ (۵۰)
(۱۱) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، صفحہ (۶۰)
(۱۲) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، صفحہ (۷۱)
(۱۳) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۹۵)
(۱۴) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۱۱۰)
(۱۵) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، صفحہ (۱۲۲)
(۱۶) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۱۹۶)
(۱۷) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، صفحہ (۲۱۰)
(۱۸) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۲۲۸)
(۱۹) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۲۳۱)
(۲۰) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۲۴۷)
(۲۱) ڈاکٹر یوسف حسین خان - فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۲۵۶)

(۲۲) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۲۶۷)

(۲۳) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۲۹۲)

(۲۴) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۳۱۲)

(۲۵) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۳۴۳)

(۲۶) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۳۵۳)

(۲۷) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۳۶۰)

(۲۸) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۳۶۳)

(۲۹) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۳۶۷)

(۳۰) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۳۶۷)

(۳۱) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۳۸۸)

(۳۲) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۳۹۸)

(۳۳) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۴۰۵)

(۳۴) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۳۸۲)

(۳۵) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۴۱۲)

(۳۶) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۴۶۲)

(۳۷) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ فرانسیسی ادب، ماخوذ صفحہ (۴۴۷)

کاروانِ فکر

"کاروان فکر" ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے چار طویل مضامین کا مجموعہ ہے جو مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع ہوا۔ کتاب کے ایک سو اٹھانوے (۱۹۸) صفحات حسب ذیل مضامین پر مشتمل ہیں۔

(۱) اخلاقی قدریں۔

(۲) علم و زندگی۔

(۳) تاریخ میں جبر و اختیار کی دھوپ چھاؤں۔

(۴) ادبی قدریں۔

یوسف صاحب علم تو اریخ کے ماہر اور ادب کے عالم تھے اور زندگی و کائنات کے تعلق سے اپنا ایک منفرد نظریہ رکھتے تھے۔ان مضامین میں انسان اور انسانیت کے اعلیٰ اقدار کو یوسف صاحب نے اپنے اسی شعور و نظریے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔اس کتاب کے دیباچہ میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں بھی تاریخی بصیرت، علمی اور ادبی اور اخلاقی اقدار سے ان کی گہری وابستگی کا ثبوت

ملتا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔۔۔

"ان اوراق میں جو بحث و گفتگو کی گئی ہے اس میں
انسانی زندگی کے محرک یعنی اخلاقی قدروں کو
خاص اہمیت دی گئی ہے۔"(۱)

ضیاء الحسن فاروقی نے اس مجموعے پر بہت سیر حاصل تبصرہ لکھا ہے۔

"یوسف صاحب تاریخ و ادب کے عالم ہیں اور
زندگی اور کائنات کے متعلق اپنا ایک سوچا سمجھا
نظریہ رکھتے ہیں، مذکورہ چاروں مضامین اگر سمجھ کر
پڑھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں تاریخ و ادب
اور علم و اخلاق کے مختلف پہلوؤں پر ایک ہی
زاویئے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔(۲)

ضیاالحسن فاروقی خود بہت بڑے عالم ہیں اور زیر بحث موضوعات پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔انہوں نے ہر مضمون کا بہت ہی عمدہ تجزیہ کیا ہے۔انہوں نے یوسف صاحب کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے۔

"فاضل منصف نے علم اور تاریخ کی روشنی میں ان
تمام مسائل سے بحث کی ہے اور آج کے انسان کے
اس ذہنی خلجان کی طرف پوری قوت استدلال سے
واضح اشارہ کیا ہے جس میں وہ زندگی کی فراوانی کے
باوجود بھٹکا ہے۔"(۳)

"کاروان فکر" کا پہلا مضمون اخلاقی قدریں ہے۔اس مضمون کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ یوسف صاحب کی نظر مختلف اسلامی علوم پر کس قدر گہری تھی۔ ان علوم کی ایک شاخ "علم الاخلاق" بھی ہے۔علم الانسان، علم الادیان اور علم

الاخلاق یہ وہ اہم موضوعات تھے جنہیں کبھی مشرقی علوم کے نصاب میں لازماً شامل رکھا جاتا تھا اور طالب علم کے لیے ان علوم پر عبور حاصل کرنا ضروری ہوتا تھا۔ ان کے مضمون "اخلاقی قدریں" کو علم الاخلاق کا خلاصہ کہنا بجا ہوگا۔

اس مضمون میں انہوں نے علم الاخلاق کے تحت اٹھائی جانے والی مختلف بحثوں کو یکجا کر دیا ہے۔ مثلاً انسان کا وجود، انسان کی تخلیق، خدا کی دوسری مخلوقات کے مقابلے میں انسان کا منصب و مقام پھر حیات انسانی کی ارتقائی منزلیں، کائینات میں ہم آہنگی، انسانیت کے نشو و نما میں اخلاقی اقدار کی اہمیت ایسے تمام موضوعات کو انتہائی مختصر مگر جامع انداز میں انہوں نے یکجا کیا ہے اور جہاں جہاں ضرورت پیش آئی ہے وہاں انہوں نے ہر موضوع پر تنقیدی بحث بھی کی ہے مثلاً اخلاق کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں۔

> "اخلاق کے چاروں طرف جبلتیں اور خواہشیں اپنا
> گھیرا ڈالے رہتی ہیں کہ بغیر ان کے اخلاقی زندگی کا
> تصور ہی ممکن نہیں (۴)

یوسف صاحب کا خیال ہے کہ جبلتوں اور خواہشوں سے فرار ممکن نہیں بلکہ ان کا وجود حیات انسانی کے لیے ضروری ہے گویا ان کے خیال میں جبلت اور خواہش نہ ہو تو اخلاقی زندگی میں خلا پیدا ہو جائے گا۔ زندگی کے حیوانی اور روحانی عناصر کی کشمکش اخلاق میں اپنا حل تلاش کرتی ہے۔ اس لیے اس میں انسان کی انفرادی اور عالم گیر زندگی ایک دوسرے سے ہمکنار ہو جاتی ہے (۵)

حیات انسانی میں اخلاقی اقدار کی مرکزیت اور اہمیت کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ حیات انسانی میں اختیار و انتخاب ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر شخص کے لیے جاننا اور ماننا ضروری ہے۔ اگر چہ ہمارے عمل کو متعین کرنے میں یہی ایک عنصر نہیں ہوتا، تاہم یہ ایک نہایت اہم عنصر ہے۔

کائنات میں انسان ہی کا ایک وجود ایسا ہے جو شعور رکھتا ہے۔وہ محض ارتقاء کا نتیجہ نہیں۔بلکہ وہ اس کے ایک عامل یعنی ایجنٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔خاندان، سوسائٹی، قوم، بین الاقوامی اتحاد ان سب سے اس کی قوت ارادی کا احساس ہوتا ہے۔یہ خود بہ خود فطری طور پر وجود میں نہیں آتی بلکہ شعوری طور پر اسے وجود میں لایا جاتا ہے۔

اخلاق کو مذہب و عقیدے سے بے تعلق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مذہب اور عقیدہ ہی وہ عوامل ہیں جو اخلاقی اقدار کی صورت گری بھی کرتے ہیں اور انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی بھی۔اس پوری بحث کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور انسانی معاشرہ میں اخلاقی قدروں کی اہمیت کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے آج کی نسل جو مادیت کی طرف تیزی کے ساتھ گامزن ہے اور روحانیت سے دور جاپڑی ہے۔اس کا احساس بھی مصنف کو اچھی طرح تھا اس لیے انہوں نے اخلاقی اقدار کی نشو و نما، فروغ اور اس کے استحکام اور ان قدروں کی اشاعت کے لیے روحانیت پر زور دیا ہے۔اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اخلاقی قدروں کے پہنچنے کے لیے روحانیت سے وابستگی ضروری ہے۔

"کاروان فکر" کا دوسرا مضمون "علم اور زندگی" کے موضوع پر ہے۔اس پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے فلسفیانہ انداز میں دقیق بحث کی ہے۔قدیم یونانی قدما سے لیکر عرب علماء اور مغربی فلسفیوں کے خیالات اور نظریات کی مدد سے علم اور انسان کے باہمی تعلق کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔یہ مضمون بھی گویا مشرقی علوم کی ایک شاخ "علم الانسان" کا نچوڑ ہے۔

مضمون کی ابتداء میں انسان کی تخلیق، کائنات میں اس کا وجود، اس کی فطری نشو نما، انسان کی داخلی توانائی، خارجی تغیرات اور تبدیلیوں کا زندگی پر اثر ان سب سے بحث کی گئی ہے۔اس کے بعد زندگی کی مقصد کوشی، انسان کا ذہنی سفر، حیات انسانی کی ارتقائی منزلوں کے تعین میں مختلف مذاہب کا رول اور پھر علم و آگہی کے وسیلے سے

ذہن انسانی کا عروج اور عرفان یہ تمام مضامین علم الانسان کی مختلف شاخیں سمجھی جاتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنا ایک علحدہ وجود رکھتی ہیں ۔جس پر صدیوں سے فلسفی غور و فکر کرتے آرہے ہیں ۔اس موضوع کا جو حاصل ہے وہ یہی ہے جو رومی کے اس شعر میں ملتا ہے ۔ ؎

علم چوں بر دل زند یارے بود
علم چوں برتن زند مارے بود

یوسف صاحب مولانا رومی کے اس شعر سے اپنے مضمون کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علم سے اگر انسان کی اندرونی اور اخلاقی زندگی کی خدمت ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں لیکن اگر اس کا مقصد فطرت میں تصرف کر کے صرف آسائش کے سامان بہم پہنچانا یا مادی قوت حاصل کرنا ہو تو یہ کوئی بلند مقصد نہیں ہے ۔(۶)

یوسف صاحب نے اس مضمون میں انسان کے تمدنی اور تہذیبی شعور سے بھی بحث کی ہے اور انسان کی تہذیبی تاریخ کا سرسری جائزہ بھی لیا ہے کہ تہذیب کیونکہ فروغ پاتی ہے پھر اس کی وضاحت میں خود اس طرح رقمطراز ہیں ۔۔

"انسان نے جب فطرت کے میکانکی عمل کے حدود سے نکل کر اپنے اندرونی محرکوں کو نمایاں کیا اور ماحول کے جبر سے ایک حد تک آزادی حاصل کی اور اپنے شعور کو برتنا سیکھا تو خود فطرت میں تصرفات پیدا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو گئ فطرت میں تصرف و تغیر پیدا کرنے کی صلاحیت ہی تہذیب کو جنم دیتی ہے ۔یہی تاریخ کا عمل ہے ۔"

(۷)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے دنیا کی تمام قدیم تہذیبوں مثلاً یونانی تہذیب ،

رومن تہذیب، رومن تہذیب پر عیسائیت کا اثر، اسلامی تہذیب، اسلامی تہذیب میں مسیحی تصورات کی تکمیل غرض عصر حاضر کی جدید تہذیب تک انہوں نے تمام قوموں کے تہذیبی خدوخال کو جس جامع انداز میں پیش کیا ہے وہ ایک کامیاب نقاد ہی انجام دے سکتا ہے۔اس مضمون میں اپنے دعوے کی دلیلوں کے طور پر انہوں نے جن فلسفیوں کا تذکرہ کیا ہے وہ بھی ان کے مطالعہ کی وسعت پر دلالت کرتا ہے مثلاً علم اکتشافات میں "نظریہ ارتقاء" کے ضمن میں جن کے نام آئے ہیں ان میں نیوٹن، NEWTON ڈارون، DARWIN اسپنر، گیلی لیو، آئین سٹائن اور جیمس جینس وغیرہ کے علاوہ مشرقی حکماء کے نام بھی ملتے ہیں مثلاً محی الدین ابن عربی، مولانا روم وغیرہ۔ان کے علاوہ انہوں نے قرآن مجید کی ایسی بیشتر آیتوں سے بھی استفادہ کیا ہے جن کی مدد سے فلسفیانہ گتھیوں کو سلجھایا جاسکتا ہے۔ مختلف قرآنی آیات کی روشنی میں انسان اور کائنات کے موضوع پر وضاحت سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کائنات کی تغیر پذیری کے ساتھ ساتھ انسان کی ارتقائی کیفیتوں کو بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پوری بحث کے بعد یوسف صاحب یہ بھی لکھتے ہیں۔

"انسان کو اس کا علم نہیں کہ اس کا وجود کیوں ہے
؟ عالم کیوں ہے ؟ زندگی اور اس کا انجام کیا ہے ؟
ہمیں مبہم طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک صاحب
قدرت ذات ہے جو ہمیں زندہ رکھتی ہے بالکل اسی
طرح جیسے جنگل کے جانوروں اور چمن کی چڑیوں کو
زندہ رکھتی ہے ہمارے علم کے ارد گرد جو حدود
ہیں ہم ان کے پار نہیں جاسکتے۔ایسا محسوس ہوتا
ہے کہ ہمارے جو مفوضہ فرائض اور وظائف ہیں

انہیں کی چار دیواری میں ہمیں چھوڑ دیا گیا ہے۔
جس طرح مچھلی پانی کی چار دیواری میں اور پروانہ
ہوا کی چار دیواری میں محدود ہیں۔ ہم اپنی ذات
سے کچھ بھی نہیں تخلیق کرتے۔"(۸)

انسان کی قوت ارادی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن فطرت کی طرف سے اس قوت کو بھی محدود کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ انسان اور فطرت کے سارے مظاہرے قدرت کے بنائے ہوئے منصوبوں کے پابند ہیں۔ فطرت کا قانون جس طرح طوفانوں کو ابھارتا ہے اسی طرح وہ انہیں حدود کے اندر رکھ کر فرو بھی کر دیتا ہے۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ یہاں انہوں نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی قوت کا جو تجزیہ کیا ہے وہ عصر حاضر کے حالات پر بھی منطبق ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں۔۔۔

"قوموں اور نسلوں کی نقل و حرکت طوفانی اور
ہیجانی نوعیت رکھتی ہے۔ جب توانائی میں کمی آتی
ہے تو خود بہ خود یہ نقل و حرکت رک جاتی ہے اور
سکون پیدا ہو جاتا ہے، سکندر، محمود غزنوی، چنگیز
خاں، محمد بن قاسم اور نپولین اس کی تاریخی مثالیں
ہیں۔"(۹)

توانائی کی اپنی مقررہ حدود ہیں جو خود اس میں ودیعت ہیں جس طرح ہمیں توانائی (انرجی) کی ابتدا۔ کا علم نہیں اسی طرح مقاومت کی ابتدا۔ کا علم نہیں۔ لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ رد عمل کے طور پر دوسری قوت کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کے اندر چھپی ہوئی بے شمار تخلیقی اور تعمیری قوتوں کو اگر روحانی اور اخلاقی اقدار کی رہنمائی نہ ملے تو وہ قوتیں انسان اور کائنات کے حق میں بے فیض

ہو جاتی ہیں ۔اس لیے عصر حاضر میں مذہب اور روحانیت کے بغیر مختلف اخلاقی اقدار جیسے حقوق انسانی کا تحفظ اور آزادی، عدل و انصاف، محبت، انسان دوستی، احترام انسانیت، رواداری یہ سب کھوکھلے نعرے بن گئے ہیں ۔اس کا ثبوت ہم کو اقوام متحدہ جیسے عالمی ادارہ کی سرپرستی میں چلائے جانے والے بے شمار منصوبوں کی ناکامی سے ہو سکتا ہے۔

"کاروان فکر" کے تیسرے مضمون کا عنوان "تاریخ میں جبر و اختیار کی دھوپ چھاؤں" ہے ۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں بنیادی طور پر تاریخ کے استاد تھے اور اس مضمون میں ان کی ایک عالمانہ تاریخی بصیرت ملتی ہے ۔اس عنوان کے تحت انہوں نے عمرانی تاریخ کے مختلف گوشوں سے بحث کرتے ہوئے تاریخی انقلابات، قوموں کے عروج و زوال، تہذیب و تمدن کے مختلف دھاروں کی آمیزش کی روشنی میں جبر و اختیار کے فلسفہ کو سمجھانے کی کوشش کی ہے ۔جبر و اختیار ایک ایسا فلسفہ حیات ہے جس کو عقلی اور روحانی دونوں اصولوں کی روشنی میں پرکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔یہ وہ مسئلہ ہے جس کا تعلق بیک وقت فرد کی زندگی سے بھی ہے اور قوموں کی تاریخ سے بھی ۔ہر زمانے اور ہر دور میں ایسے فلسفی پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے جبر و اختیار کے مسئلہ کو اپنی اپنی فکر کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کی ہے ۔ بعض فلسفیوں نے انسان کو مجبور محض ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ انسان کے ساتھ یا قوموں کے ساتھ جو کچھ واقعات پیش آتے ہیں اچھے یا برے وہ سب کے سب تقدیر کے تابع ہیں ۔اس نظریہ نے بعض وقت انسانوں اور قوموں کی مخفی صلاحیتوں کو مفلوج بھی کر دیا ہے ۔انہوں نے ایسے بہت سے نظریات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قوموں میں یہ احساس پیدا کیا گیا ہے کہ جب تک وہ خود اپنی حالت نہیں بدلیں گے تب تک کوئی ان کی حالت نہیں بدل سکتا۔یہ ثابت کرنے کے لیے انہوں نے دنیا کی دو اہم قوموں کے تاریخی واقعات کو

پیش کیا ہے ۔ایک رومیوں کے زوال کا واقعہ ہے کہ ایسے وقت میں جب کہ رومی تہذیب آخری سانس لے رہی تھی اس وقت اس تہذیب کو جو از سرنو زندگی ملی وہ عیسائی مذہب کی تعلیمات کے سبب ملی ۔اسی طرح بعد کے دور میں دم توڑتی ہوئی انسانیت کو جو نئی زندگی ملی وہ پیغمبر اسلامؑ کی حیات طیبہ اور اسلامی تعلیمات کے سبب ملی چنانچہ وہ لکھتے ہیں ۔۔۔

" مسیحیت نے زندگی کا پیغام پیش کیا اور رومن
تہذیب کو ، جس کا ڈنکا ساری دنیا میں بجتا تھا ،
درویشانہ ملک کے سامنے ہار ماننی پڑی ۔اس عہد کی
اصلی تخلیقی قوت کا مظہر سیزر نہیں ، حضرت مسیح
ہیں ۔ اسی طرح چند صدی بعد مغربی ایشیا میں
تخلیقی قوت کا اظہار آں حضرت محمدؐ کی حیات طیبہ
میں ہوا نہ کہ ہرقل اور خسرو کی زندگی میں ۔ان
دونوں پیغمبروں کی تعلیمات میں حقیقی تخلیقی
آزادی کو اظہار کا موقع ملا جو زندگی کا جوہر بن گئی
اور اس سے انسانی وجود اجاگر ہوا ۔" (۱۰)

اس پورے مقالہ میں یوسف صاحب نے مختلف قرآنی آیات کے حوالے سے اور احادیث کی روشنی میں اور عربی حکماء کے فلسفیانہ افکار کی مدد سے فلسفہ زماں و مکاں ، فلسفہ تاریخ اور مسئلہ جبر و اختیار کو سمجھانے کی کوشش کی ہے ۔

ابن خلدون کے مقدمہ سے بھی انہوں نے استفادہ کیا ہے اور ان کے پورے مقالے کا حاصل قرآن کا وہی پیام ہے جس میں کہا گیا ہے کہ خدا نے کبھی اس قوم کی حالت نہیں بدلی جب تک اس قوم کو آپ اپنی حالت کے بدلنے کا خیال نہ آئے ۔(۱۱)

حالی نے بھی اسی مضمون کو یوں باندھا ہے ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو احساس جس کو اپنی حالت کے بدلنے کا

حالت کے بدلنے کے لیے فکر کی آزادی اور تخلیق کی آزادی ضروری ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ قرآنی تعلیمات نے انسان کو آزادی کی نعمت عطا کی ہے اور وہ اپنے ارادہ میں خود مختار ہے اور اختیار کی آزادی رکھتا ہے ۔ حسن انتخاب میں اس کا شعور آزاد ہے اب یہ انسان کے شعور، ادراک اور اس کی صحیح فکر پر منحصر ہے کہ وہ اپنے لیے کونسا راستہ اختیار کرتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں ۔۔۔

"جب کبھی وہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہے گا تو
مقصد تخلیق کی تکمیل کرے گا" ۔(۱۲)

غرض ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اس مقالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تاریخ اور تقدیر کے مسائل کا حل انسان کے تخلیقی ولولے میں مضمر ہے اور یہ تخلیقی ولولہ صرف مادیت سے منسلک نہیں بلکہ اس کا تعلق روحانیت سے بھی ہونا ضروری ہے ۔ یعنی انسان کا تخلیقی عمل، قوانین فطرت اور قانون الہیٰ کے مطابق ہو تو بنی نوع انسان کے حق میں زندگی حقیقی مسرتوں کا پیغام بن سکتی ہے ۔

"کاروان فکر" کا چوتھا مضمون "ادبی قدریں" کے عنوان پر مشتمل ہے ۔ اس مقالہ کی ضیاء الحسن فاروقی نے اس طرح داد دی ہے اور یوسف صاحب نے جس مکمل انسان کی نشاندہی کی ہے اس کے بارے میں لکھا ہے ۔

"اپنے مقالے میں بھی مصنف نے ادب سے متعلق
مختلف نظریوں اور تحریکوں پر روشنی ڈالی ہے اور
سب کا تجزیہ کرنے کے بعد نتیجہ یہی نکالا ہے کہ
ادیب کو معاشی انسان، سیاسی انسان یا جمالیاتی
انسان کی اصطلاحوں میں نہیں سوچنا چاہیئے ۔۔۔

مکمل انسان کی عکاسی کے لیے اخلاق کی ہمہ گیری کا
تصور ناگزیر ہے۔ اس طرح کا ادب کبھی فرسودہ
نہیں ہوتا، اس کا اثر قائم رہتا ہے اور قائم رہے گا
جب تک کہ اس کرہ ارض پر انسان بستے ہیں۔"

(۱۳)

یاد رہے کہ اس کتاب کا پہلا موضوع "اخلاقی قدریں" تھا یعنی انسانیت کے جن اعلیٰ اقدار سے اس کتاب کا آغاز ہوا انہیں اقدار پر یہ کتاب اختتام کو بھی پہنچی۔ ادبی قدروں کے تعین میں انسانیت کے اعلیٰ اقدار سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ جب ادب کا مرکزی محور انسان کی ذات ہے تو انسانیت کی اعلیٰ اقدار خود بہ خود ادب کے موضوعات میں شامل رہیں گے کیونکہ پورا انسانی معاشرہ ان ہی اقدار سے عبارت ہوتا ہے۔ یوسف صاحب نے مختلف ادبی تحریکوں کے پس منظر میں اس موضوع پر فلسفیانہ بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ہر دور کے ادیب نے اپنے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق انسان کو مختلف روپ دینے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً یہ کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں جب معاشیات کے ماہرین نے معاشی انسان کی تخلیق کی تو ادیب بھی اسی معاشی انسان کی ترجمانی کرنے لگا۔ اسی طرح انیسویں صدی میں جب جمالیاتی انسان نے جنم لیا تو ادیب کا قلم اسی کا ترجمان بن گیا۔

یوسف صاحب کا خیال ہے کہ ادیب کو معاشی انسان، سیاسی انسان یا جمالیاتی انسان کی اصطلاحوں میں نہیں سوچنا چاہیئے اس کا فرض ہے کہ مکمل انسان کی عکاسی کرے نہ کہ اس کے کسی جزکی اور مکمل انسان کی عکاسی کے لیے اخلاق کی ہمہ گیری کا تصور ناگزیر ہے۔ اس قسم کا ادب کبھی فرسودہ نہیں ہوتا۔ اس کا اثر دیرپا ہے یعنی ایسا ادب اور ادیب دونوں بھی زماں و مکاں کی قید سے ماورئی ہوتے ہیں۔ یہ مقالہ ان ہی موضوعات پر مشتمل ہے۔

اس میں بھی یوسف صاحب نے مغربی ادیبوں ، فنکاروں اور مفکروں کے افکار سے تفصیلی بحث کی ہے اور ان کے مختلف نظریات کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے ۔ عالمی ادب پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ادبی اقدار کی اپنے زاویہ نظر سے وضاحت کی ہے ۔اسی وضاحت کے دوران انہوں نے تاثراتی، تجزیاتی اور نفسیاتی تنقیدی اصولوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

غرض یوسف صاحب کا یہ مقالہ قدیم کلاسیکی ادب سے لے کر تہذیب جدید کے عصری ادب کے ذہنی سفر تک کی داستان بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے اور اس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہ جاتا۔

حوالے

---

(۱) ڈاکٹر یوسف حسین خان، کاروان فکر، دیباچہ، صفحہ (۹)
(۲) ضیاء الحسن فاروقی، (تبصرہ) کاروان فکر، صفحہ (۱۲۳)
(۳) ضیاء الحسن فاروقی، (تبصرہ) کاروان فکر، صفحہ (۱۲۴)
(۴) ڈاکٹر یوسف حسین خان، کاروان فکر، صفحہ (۵۶)
(۵) ڈاکٹر یوسف حسین خان، کاروان فکر، ماخوذ، صفحہ (۵۶)
(۶) ڈاکٹر یوسف حسین خان، کاروان فکر، ماخوذ صفحہ (۵۷)
(۷) ڈاکٹر یوسف حسین خان، کاروان فکر، صفحہ (۷۴)
(۸) ڈاکٹر یوسف حسین خان، کاروان فکر، صفحہ (۱۰۳)
(۹) ڈاکٹر یوسف حسین خان، کاروان فکر، صفحہ (۱۰۴)
(۱۰) ڈاکٹر یوسف حسین خان، کاروان فکر، صفحہ (۱۵۷)
(۱۱) ڈاکٹر یوسف حسین خان، کاروان فکر، ماخوذ، صفحہ (۱۲۴)
(۱۲) ڈاکٹر یوسف حسین خان، کاروان فکر، صفحہ (۱۵۷)
(۱۳) ضیاء الحسن فاروقی، (تبصرہ) کاروان فکر، صفحہ (۱۳۱۔۱۳۰)

یادوں کی دنیا

زندگی کا مسافر چلتے چلتے جب تھکنے لگتا ہے تو سر شام کسی مسافر نواز پیڑ کے نیچے ستانے بیٹھ جاتا ہے اور شب بسری کا خیال آنے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے طے شدہ راہ زندگی پر نگاہ واپس ضرور ڈالتا ہے ۔ کتنے مرد و زن ملے کون ساتھی تھے ؟ وہ کون تھے ؟ جن کی انگلی تھامے وہ بڑھتا گیا ۔ کیسے کیسے اوبڑ کھابڑ راستے بھی ملے ، گھاٹیاں ، میدان ، خار دار جنگل ، بہتے چشمے ، لہلہاتے گلستاں ، کن کن موڑوں پر کن کن کا ساتھ چھوٹا ، کون نظر سے اوجھل ہوا ، کس کی یاد بہت دور تک سمجھانے ساتھ آئی ، خود نے کتنوں کو سہارا دیا کتنوں کی رہنمائی کی ۔ کب صبح دوپہر میں تبدیل ہوئی ۔ تپتا سورج کب ڈھلا اور اچانک سر شام ستاتے ہوئے یہ احساس ہوا کہ وہ اکیلا ہے بالکل اکیلا اب نہ دل میں جوش نہ اعضاء میں توانائی ۔جی چاہتا ہے کہ دن بھر کا تھکا ماندہ چپ چاپ سو رہے ۔ اچانک معلوم ہوتا ہے کہ اطراف کے ماحول سے ناطہ ٹوٹ گیا ہے ۔ لیکن وہ پھر بھی تنہا نہیں ہے یادوں کا ہجوم اسے گھیرے ہوئے ہے ۔ فانوس سے خیال گم شدہ محفلوں کی بزم آرائی کرتا رہتا ہے ۔ کھوئے ہوؤں کی جستجو اسے پھر ایک بار

ماضی کی وادیوں میں گھماتی ہے۔ برسوں کی مسافت لمحوں میں طے ہو جاتی ہے۔ لیکن سب کچھ یاد نہیں۔ بس وہی کچھ جس نے روح کو جھنجھوڑا یا تار نفس کو چھیڑا۔۔۔ ماضی کی ان یادوں کا یہ ہجوم ہر ایک کے سامنے سے گزرتا ہے مگر گرفت میں نہیں آتا، ہاں مگر آدمی کے ہاتھ میں قلم یا موقلم ہو۔۔۔۔۔یہاں کسی انگریزی نظم کا چھوٹا ترجمہ شدہ ٹکڑا یاد آتا ہے

"اکثر شب تنہائی میں
کچھ دیر پہلے نیند کے
گزری ہوئی دلچسپیاں، بیتے ہوۓ دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی، اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دل صد چاک پر"

شاید یوسف صاحب بھی انگریزی کی ان نظموں سے ضرور متاثر ہوئے ہونگے تب ہی انہوں نے یادوں کے ہجوم سے یہ یادیں اکٹھا کیں۔

FAMILIAR FACES

I have had playmates, I have had companions
In my days of childhood, in my joyful school-days;
All, all are gone, the old familiar faces

I have been laughing, I have been carousing
Drilling late, silting late, with my bosom cronies;
All, all are gone, the old familiar faces

I loved a Love once, fairest among women;
Closed are her doors on me, I must not see her
All, all are gone, the old familiar faces

I have a friend, a kinder friend has no man;
Like an ingrate, I left my friend abruptly

Left him, to muse on the old familiar faces,

Ghost-like, I paced round the haunts of my childhood;
Earth seem,d a desert I was bound to traverse,
Seeking to find the old familiar faces

Friend of my bosom, thou more than a brother,
Why west not thou born in my father,s dwelling
So might we talk of the old familiar faces

How some they have died, and some they have left me,
And some are taken from me, all are deparied;
All, all are gone, the old familiar faces

G.Lamb.

THE LIGHT OF OTHER DAYS

Oft in the stilly night
Ere slumber,s chain has bound me
Fond Memory brings the light
Of other days around me
The smiles, the tears
Of boyhood,s years
The words of love then spoken;
The eyes that shone,
Now climm,d and gone,
The cheerful hearts now broken!
Thus in the stilly night
Ere slumber,s chain has bound me,
Sad memory brings the light
Of other days around me
When I remember, All
The friends so link,d together
I,ve seen around me fall
Like leaves in wintry weather,
I feel like one
Who treads alone
Some banquet-hall deserted,
Whose lights are fled

Whose garlands dead
And all but he departed!
Thus in the stilly night
Ere slumber,s chain has bound me.
Sad memory brings the light
Of other days around me

T. MOORE

• ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے مصوری کبھی نہیں کی۔ شاید شعر بھی نہیں لکھے مگر آنکھ مصور کی دل شاعر کا رکھتے تھے اور ہاتھ میں بسیار نویس قلم تھام رکھا تھا۔ چنانچہ جب یادوں کا پٹارا شام زندگی میں کھلا تو "یادوں کی دنیا" وجود میں آئی۔ اس یادداشت نے کچھ یادوں کو اکٹھا کر دیا۔ اسے سوانح عمری کہنا زیادتی ہوگی۔ سوانح عمری میں واقعات کو خارجی اور داخلی تسلسل اور دستاویزی شہادتوں کے ساتھ ترتیب دینا ضروری ہے۔ ادیب دوسروں کی سوانح عمری اس طرح لکھ سکتا ہے لیکن اپنی سوانح عمری ہی ایک ایسی چیز ہے جو ادیب سے استدلال کا مطالبہ کرتی ہے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنا خاص طور پر آخری عمر میں جب کہ سوانح عمری لکھنے کا خیال آئے ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر ادیب اپنی یادداشتیں مرتب کرتے ہیں اور حاصل عمر ہمارے حوالے کر جاتے ہیں۔

یہ یادداشتیں بڑی اہم ہوتی ہیں کیونکہ ان میں آدمی اپنے ماحول، تجربے، اعمال اشکال، دوستوں اور دشمنوں کی داستاں دلچسپ انداز میں سناتا ہے۔ ان میں حقیقت بھی ہوتی ہے اور افسانہ طرازی بھی۔ ان میں ہو بہو عکاسی نہیں ہوتی بلکہ مرقع نگاری کی رنگ آمیزی ہوتی ہے۔ وہ ہمیں وہی دکھاتا ہے جو خود دیکھنا پسند کرتا ہے۔ اگر آدمی ادیب ہے تو ان یادداشتوں کے ذریعے اس کے کردار، اس کے ماحول اس کے اثر اور اس کی شخصیت کی تہہ در تہہ کیفیتوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایسے ادب کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم اس پورے دور کے مزاج کو سمجھ سکتے ہیں۔

یادداشتی ادب عام طور پر اس زمانے میں زیادہ لکھا جاتا ہے جب زمانے کا

مزاج بدلتا ہے، ماضی کی یادگاریں گرنے لگتی ہیں یا گرائی جاتی ہیں۔اس وقت شاید لاشعوری طور پر ہم ماضی کے کھنڈروں کے ملبے سے نادر و نایاب چیزوں کو بچالینے کی کوشش کرتے ہیں۔ان یادداشتوں میں لکھنے والے کو پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ یادوں کے گودام سے صرف منتخب حکایتں اور شکایتیں چن لے اور اگر ادیب قلم سے مصوری کرناجانتا ہے تو وہ ان کو نئے سرے سے زندگی اور تابندگی عطا کرسکتا ہے اور پڑھنے والا ونڈر لینڈ کی ایلس کی طرح حیرانی استعجاب اور دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگتا ہے کہ اپنی ذات کو بھول کر اس ماحول میں تھوڑے عرصے کے لیے گم ہوجاتا ہے۔

یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ معلوم ہوگا کہ بہت سیدھے سادے رواں انداز میں یوسف صاحب نے اپنی یادداشتوں کی ایسی داستاں سنائی ہے کہ پڑھنے والا اس میں اپنے آپ کو گم کرلیتا ہے۔

" یادوں کی دنیا " ۴۴۲ صفحے کی کتاب دارالمصنفین کی طرف سے ۱۹۶۷ء میں چھپی۔اس کتاب کے تعلق سے سید صباح الدین عبدالرحمن نے لکھا ہے۔۔

> " ان کی یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی۔یہ گویا ان کی خود نوشت سوانح عمری کی شکل میں ان کے بیتے ہوئے زمانے کی یادیں ہیں، ان کی قوت ارادی نے ان کے حافظے کے دروازے کو کھٹکھٹایا تو یہ سب کی سب لبیک کہتی ہوئی حاضر ہوئیں، جس میں جذبہ کی رنگ آمیزی اور خیالی پیکروں کی تخیل کے ساتھ ان کے آباء و اجداد، خاندان، ڈاکٹر ذاکر حسین، جامعہ ملیہ، دیار فرہنگ، دیار تلنگ، علی گڈھ اور بہت سی علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں کا بہت ہی دلچسپ مرقع ہے "(۱)

یوسف صاحب نے ۶۴ سال کی عمر میں یہ کتاب لکھی۔ ۶۰ سال کے بعد شاید آدمی کو اچانک یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اب چل چلاؤ کا وقت ہے حالانکہ وہ اس کے بعد بھی ۹ سال اور زندہ رہے۔ انہوں نے سرنامے کے طور پر یہ مصرع استعمال کیا ہے۔

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

عمر رفتہ کو آواز دینے کے بعد کچھ یوں ہی آدمی سوچتا ہے کہ عمر گزراں میں اس نے کیا کھویا کیا پایا، پانے کی بات تو یہ ہے کہ بہت کچھ پا کر آدمی کو خوشی ضرور ہوتی ہے لیکن پھر وہ نئی خوشیوں کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ لیکن جو کچھ کھویا وہ لوٹایا نہیں جا سکتا۔ اس کی کسک احساس کے اندر ضرور موجود رہتی ہے اور جب دشت تنہائی میں حیات کے قدم بوجھل ہو جاتے ہیں تو یادوں کے چراغ ایک ایک کر کے روشن ہوتے جاتے ہیں اور دل کو ڈھارس بندھاتے ہیں۔ یہ یادیں دل کو دکھاتی بھی ہیں، دلاسا بھی دیتی ہیں اور سمندری جہاز کی جس طرح لائٹ ہاؤس گہرے سمندروں میں دور تک رہنمائی کرتے اور راستہ روشن کرتے ہیں اسی طرح یہ یادیں ماضی کی گپھاوں سے اپنی شعاعیں لمحہ موجود تک پہنچاتی ہیں حالانکہ اطراف گہرا اندھیرا ہے۔ لیکن ان شعاعوں کی لکیر پر چلتے ہوئے تنہا آدمی بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔ ظلمات کا عفریت اسے نگل نہیں سکتا۔

اس کتاب میں کوئی آٹھ باب ہیں۔ لیکن ان آٹھ ابواب کی تفصیل ایسی نہیں جو انہیں ان کے عنوان تک محدود رکھے۔ چونکہ بات یادوں کی ہے تو ان ابواب کے مختلف صفحوں پر دوسرے اشخاص اور مقامات، جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

دیباچہ میں انہوں نے اس کتاب کے معرض وجود میں آنے اور ترتیب پانے کی توجیہ اس طرح کی ہے۔

" خیالی نقوش جب صفحہ۔ قرطاس پر اتارے جاتے ہیں تو جذبے کی رنگ آمیزی بھی کسی نہ کسی

صورت میں راہ پا جاتی ہے اور خیالی پیکروں میں
ایسی تحلیل ہو جاتی ہے کہ اسے ان سے جدا نہیں کیا
جا سکتا۔"(۲)

اس میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ انھیں روز نامچہ لکھنے کی لڑکپن سے عادت رہی ہے اگرچہ اس کی پابندی ہر وقت ممکن نہ ہو سکی۔ اپنے حافظے کو کھنگال کر اور اپنے روز نامچے کے واقعات سے انتخاب کر کے اور اپنے تخلیقی قلم کی سحر کاری کو کام میں لاتے ہوئے انہوں نے اس کتاب کی تخلیق کی ہے۔ دیباچہ کے آخر میں انہوں نے حسرت کا مشہور و معروف شعر درج کیا ہے۔

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

یاد آنے لگتی ہے تو اکثر آتی ہی رہتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بہت سی ذیلی یادیں بھی لگی لپٹی چلی آتی ہیں اور محفل خیال سجانے لگتی ہیں۔ جیسے کوئی بچہ جو اپنے کوئی کھوئے ہوئے کھلونے کو یاد کرتا ہے تو ان سب کھلونوں کا خیال آتا ہے جو ٹوٹ گئے تھے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ کس نے دیئے تھے اور کب دیئے تھے اور کتنے دنوں انھوں نے کیسے کیسے دل کو لبھایا تھا یہ سب یاد آتا ہے یوسف صاحب نے خود ہی کہا ہے۔

"یادوں کی منطق بھی کچھ عجیب ہے۔ ایسی بھولی
بسری باتیں بعض دفعہ کسی چیز کو دیکھ کر یاد آجاتی
ہیں کہ جن کا شان و گمان بھی نہیں تھا اور نہ جانے
کب سے وہ حافظے کے کس کونے کھدرے میں دبی
دبائی رہتی ہیں"(۳)

ہمارا خیال ہے کہ یادیں کچے ریشم کے دھاگوں کا گچھا ہوتی ہیں۔ ایک تار

کھینچو تو کئی تار اس کے ساتھ خود بہ خود نکل آتے ہیں ۔ ممکن ہے یوسف صاحب نے سوچا ہوگا کہ اپنی شخصیت پر اثرانداز ہونے والے واقعات اور متاثر کرنے والے افراد کی کہانی ہمیں سنائیں اور وہی یادیں ہمیں دے جائیں لیکن جب انھوں نے لکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ یادیں تو اپنی بستیاں بسا رہی ہیں اور ایک پوری دنیا عالم خیال میں آباد نظر آتی ہے۔

یوسف صاحب کی دیگر تصانیف پر نظر ڈالیئے تو وہ یا تو تاریخ کے محقق ہیں یا ادب کے نقاد لیکن اس کتاب میں ان کی ذات اپنی بیشتر کامرانیوں ، محرومیوں اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے ۔ان کا انداز سب سے جدا ہے ۔زندگی میں جس طرح وہ لیئے دیئے رہے سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی سب سے الگ اپنے آپ میں مست ۔ نہ کسی کے بہت دوست نہ کسی کے نمایاں دشمن ۔ لکھنے پڑھنے میں مگن ، اپنی ذات میں گم ، بہ قدر ضرورت دوسروں کے ساتھ مگر دراصل اپنی دنیا میں مطمئن ۔اس کیفیت کو واضح طور پر ان صفحات کے اندر محسوس کیا جاسکتا ہے ۔ان کے اندر ۔احساس جمال اور تاثر پذیری کی جو کیفیت ہے وہ تحریر کو بہت دل آویز طرز بیان بخشتی ہے چنانچہ بقول شاعر ؎

کچھ اصل ہے کچھ خواب ہے کچھ طرز ادا ہے

" یادوں کی دنیا " کا پہلا باب " پس منظر " اور دوسرا باب آباء و اجداد " کے عنوان سے ہے ۔ان دو ابواب میں انھوں نے قائم گنج اور اس کے بسانے والوں کے بارے میں لکھا ہے ۔اپنے مورث اعلیٰ مدہ آخون " کی شخصیت اور نسل اور باپ دادا کا ذکر کیا ہے ۔یوسف صاحب اتفاق سے ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو اہل سیف ہونے سے زیادہ اہل قلم و اہل علم کی حیثیت سے پہچانا گیا ہے ۔ان کے والد کے زمانے میں دق کا موذی مرض گھر میں در آیا ۔ان دنوں اس کا کوئی حتمی علاج نہ تھا ۔چنانچہ عین عالم عروج میں وہ چل بسے ۔اس وقت یوسف صاحب پانچویں سال میں تھے ۔

یتیمی کا دکھ بڑی عمر والوں کے لئے بھی سہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یتیم ہوتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے گھنے پیڑ کی چھتر چھایا سے اچانک گرمی کی تپتی دھوپ میں گھسیٹ کر کھڑا کر دیا۔ یہ تو بچپن، بے حد کم سنی میں یتیم ہوئے۔ اس وقت شاید یہ احساس نہ ہوا ہو کہ کیسا داغ لگا ہے لیکن جوں جوں بچپن لڑکپن میں بدلا یہ داغ بہت زیادہ دل دکھانے لگا۔ بے سہارگی اور تنہائی نے بچپن کو ایک خول میں بند کر دیا۔ معلوم نہیں کب کب کہاں کہاں انھیں باپ کی شفقت اور رہنمائی کی ضرورت پڑی مگر ایک ہلکی سی کسک کے سوا اس کا اظہار ان صفحات میں کہیں بھی کھل کر نہ ہو سکا۔

یوسف صاحب نے دو تین جگہ اپنے والد کی نفاست پسندی اور طبیعت کی نزاکت کا ذکر کیا ہے سنجیدگی، سوجھ بوجھ کا بھی، دیانت داری اور محنت و جفاکشی کا بھی۔ ان کے ذکر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ منصوبہ بندی کرتے تھے اور سنجیدگی سے اس پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ وہ صاحب رائے تھے اور بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ معاملات کو نپٹاتے تھے۔ ان میں سے چند خصائل کا پرتو یوسف صاحب کی ذات میں بھی نظر آتا ہے۔ باقاعدگی، ترتیب، محنت پسندی، اور نفاست یوسف صاحب کی ذات کا بھی جز ہے۔

کتاب کا تیسرا باب "سات بھائی" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں یوسف صاحب نے اپنی ست پوتی ماں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو بچوں کی عاشق زار تھیں۔ بچوں کے یتیم ہو جانے پر ان کی والہانہ محبت اور شیفتگی اور بڑھ گئی تھی۔ انہیں ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا کہ ان کے سات بیٹوں کو ٹوکا نہ لگے۔ مگر ٹوکا لگنا تو قسمت میں تھا۔ سات بیٹوں میں ایک کم سن بیٹے کا غم تو دیکھا لیکن خود بھی ان کے باپ کے پاس چلی گئیں۔ اور تین بیٹے تندرست کڑیل جوان ایک کے بعد دیگرے رخصت ہوئے ایک دو کی موت تو ایسی تھی جس نے اپنوں کو تو کیا غیروں کو بھی رلا دیا۔

یوسف صاحب کو ۹ سال کی عمر میں یتیمی کے ساتھ لیسیری بھی تحفہ میں ملی۔

اس دن وہ بہت روئے پھر شاید صبر آگیا۔ یہ صبر نہیں تنہائی کی استقامت تھی ۔ اس شفقت سے محروم ہونے کے بعد تو بس کتابوں کے صفحوں میں ہی پناہ مل سکتی تھی اور یہی انھوں نے ڈھونڈ لی ۔ اس پناہ گاہ نے انھیں لڑکپن اور جوانی میں ہر قسم کی ترغیبات سے محفوظ رکھا۔

یوسف صاحب نے تنہائی اور مطالعہ کی عادت تو ڈال ہی لی تھی ۔ لیکن جب آنکھیں بوجھل ہونے لگیں تو وہ خاموش فطرت کے حسن کی طرف مائل ہوئے ۔ کیونکہ یہ چپ چاپ ماحول تنہائی میں مخل نہیں ہوتا۔ اسی مشاہدہ نے انہیں الفاظ کی مصوری سکھائی ۔

" ہمارا گھر چاروں طرف آموں اور نارنگیوں کے باغوں سے گھرا ہوا تھا۔ مارچ کے مہینے میں ان سے بھینی بھینی اور جاں فزا خوشبو کی لپٹیں نکلتیں جو جذبے اور تخیل کو اکساتی تھیں ۔ خاص کر نارنگی اور میٹھے کے شگوفوں سے جو مہک نکلتی اسے میں آدھ آدھ گھنٹہ کھڑا سانس کے ذریعہ جذب کرتا ۔ فضاء میں سیاہ بھونروں اور شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے میرا دل سکون کی کیفیت محسوس کرتا تھا۔ یہاں چڑیوں کی چہچہاہٹ صبح سے شام تک ایک لمحے کو بند نہ ہوتی تھی ۔ اس ماحول میں جنت نگاہ اور فردوس گوش شاید اکٹھا ہو گئ تھیں ۔ گھر کے زنانے حصہ کے آنگن میں چھوٹے نیم کی جڑ سے لیکر چبوترے کی بیچ کی سیڑھیوں تک بیلا، چنبیلی کے پودے تھے جن میں پھول کھلتے تو سارا چبوترہ اور

آنگن مہک اٹھتا۔ کوٹھی کے آنگن میں ہار سنگھار کا
درخت تھا جس کے ارغوانی پھولوں کی رنگت اور
خوشبو دونوں دل کو لبھاتے تھے۔ گرمیوں میں صبح
سویرے محلے کی لڑکیاں پھول چننے آتیں اور پھر ان
سے اپنی اوڑھنیاں رنگتیں۔ گرمیوں میں آم کے
باغ میں پپیہے کی پیہو پیہو اور کوئل کی کو کو سے سارا
باغ گونجا کرتا۔ انا کے گھر میں نیم کی شاخوں پر
فاختہ کی "یاہو ہو" صبح سے شام تک سنتا۔ کوٹھی
کے برآمدے کی کنگر پر کبوتروں نے اپنے گھونسلے
بنالیے تھے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اس
وقت سے ان کی غٹرغوں غٹرغوں کانوں میں بس
گئی تھی۔۔۔۔ گرمیوں کی رات میں گھر کے
اندرونی آنگن میں جگنو منڈلاتے پھرتے۔ میں کبھی
کبھی انہیں دوڑ کر پکڑ لیتا ڈھیلی مٹھی میں بند کر کے
تاریکی میں لے جاتا ان کی روشنی کے چراغ کو دیکھتا
اور چھوڑ دیتا۔ گرمیوں میں جب کالی پیلی آندھیاں
آتیں تو ساری فضاء اور زمین ان کے رنگ میں
رنگ جاتی۔" (۴)

خوشبو کے ساتھ ان کا التفات اسی زمانے میں بڑھا۔ الگ الگ پھولوں کی
خوشبو، اپنے قائم گنج کے گھر کے ارد گرد کے باغوں کی مہک، آموں کے بور سے شاخ
ٹپکنے تک کی الگ الگ کیفیت الگ الگ پھولوں کی دل لبھانے والی خوشبوئیں،
نارنگی اور میٹھے کے شگوفے یہ سب ان کی قوت شامہ کی تہذیب کرتے رہے۔ ان کی

یاد آخر دم تک ان کی زندگی کو مہکاتی رہی ۔اسی طرح سناٹے اور تاریکی سے کائنات اور اپنے رشتہ کو محسوس کرنے کی صلاحیت بھی اسی زمانے میں جاگی ۔ان چیزوں کا جب بھی وہ بیان کرتے ہیں تو پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور ہم بھی اسی فضاء میں سانس لینے لگتے ہیں ۔

لڑکپن اور نوجوانی کے ان تجربات میں صرف فطرت ہی ان کے ساتھ نہ تھی بلکہ ایک تماشائی کی حیثیت سے انہوں نے قائم گنج کی قصباتی زندگی ، اس میں بسنے والے شدید اور متصاد جذبات کے مالک ،افراد ، محبت اور نفرت کے مظاہرے ، پالتو جانور ، گھر کے نوکر ، رشتہ دار ، مکانوں کی ساخت ، چھوٹے بڑوں کا برتاؤ اطراف وقوع پذیر ہونے والے حادثات ان سب کو بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے ۔ان کے نقوش حافظے میں ان رشتوں کو قلمبند کرتے ہوئے بھی تازہ رہے ۔ مشاہدہ تو ہر ایک کرتا ہے بلکہ آنکھیں تو ہر ایک کے پاس ہیں مگر اپنے مشاہدہ سے محسوس کرنا ، سیکھنا ، نتائج اخذ کرنا ان کی ذہانت اور فطانت کی دلیل ہے ۔اسی سلسلے میں کوؤں کا ماتم اور پنجرے کے طوطے سے آزاد طوطوں کی بات چیت کی منظر کشی کا پڑھنا دلچسپی کا باعث ہوگا ۔جب وہ لکھ رہے ہیں تو اپنے حافظے کی اس البم کے بارے میں ان کا تجزیہ ان کی تحریر کے استدلال کو اجاگر کرتا ہے ۔

"اب جب کہ میں اپنے حافظے کو کھنگال رہا ہوں تو یہ سب تصویریں ایک ایک کرکے میری نظروں کے سامنے خود بخود آرہی ہیں ۔جب وہ خود بلا کسی جھجک اور تصنع کے میرے سامنے آرہی ہیں تو میرا فرض ہے کہ ان کا استقبال کروں اور ان کی قدر و قیمت کو پہچانوں ۔" (۵)

۱۹۱۹ء میں جب یوسف صاحب کی طبیعت خراب رہنے لگی تو علاج کی خاطر قائم

گنج چلے آئے۔ وہ تقریباً دو سال تک قائم گنج ہی میں رہے۔اس دوران انہیں وہاں کے مختلف اشخاص کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ علاج کے تجربے بھی ہوئے۔ یونانی، ہومیوپیتھک، پانی کا علاج اور ورزشیں۔ انہیں فائدہ بھی ہوا۔ عام طور پر ایک طریقہ علاج کے پیرو دوسرے طریقے علاج کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یوسف صاحب کی معقولیت پسندی انہیں اس اعتراف پر مجبور کرتی ہے۔

"مجھے اس علاج سے فائدہ ہوا۔ بعض ڈاکٹر دوستوں سے میں نے اس کا ذکر کیا تو ہنس کر کہنے لگے کہ اعتقاد کی وجہ سے فائدہ ہوا ہوگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹروں کا یہ خیال قطعاً غیر معقول اور غیر علمی (ان سائنٹفک) ہے۔ علاج معالجہ خالص تجرباتی چیز ہے۔ اگر عملاً کسی کو کسی خاص طریقے سے فائدہ ہو تو اسے ہنس کر اڑانا نہیں چاہیئے۔ اس قسم کی ادعا پسندی سائنس کی روح کے منافی ہے۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ ہومیوپیتھک علاج کے متعلق بھی ڈاکٹر صاحبان اسی قسم کی غیر سائنٹفک باتیں کہتے ہیں۔ حالانکہ اس کے فوائد سے سوائے ہٹ دھرمی کے انکار نہیں کیا جاسکتا۔" (٦)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں یوسف صاحب کا شعور پختہ ہوتا گیا ان کی علمی استعداد بڑھی اور مشاہدے کی قوت نکھری تو انہوں نے ہر تجربے اور عمل کی تہہ میں پہنچنے کی کوشش کی۔ وہ اگرچہ جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کا مزاج رکھتے تھے مگر ان میں تجزیاتی صلاحیت بھی تھی جو انہیں حقیقت اور سائنٹفک طریقہ تحقیق کی ترغیب دیتی رہی۔ اسی سے ان کی تحریروں میں بھی توازن پیدا ہو گیا۔ جن اشخاص سے

وہ متاثر ہوئے ان میں محمد مبین خاں صاحب نے ان پر بحد اچھا اثر ڈالا۔ وہ شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی کے سلسلے میں مرید تھے۔ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ علم مجلسی سے واقف تھے۔ شاہ صاحب کا اردو فارسی دیوان ان سے پڑھوا کر سنتے تھے۔ سن کر اکثر اشعار دہراتے جس کی وجہ سے یوسف صاحب کو بہت سے اردو فارسی کے اچھے شعر ازبر ہوگئے۔ وہ شاہ صاحب کا ایک معجون کا نسخہ بھی بنایا کرتے تھے۔ خود کھاتے اور یوسف صاحب کو بھی کھلاتے تھے۔ آخر عمر تک یوسف صاحب کو اس معجون کا ذائقہ یاد رہا۔ یوسف صاحب کی قوت ذائقہ اس زمانے میں شاید تربیت یافتہ ہوئی ہوگی کیونکہ وہ جب بھی ذائقہ کا ذکر کرتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ گنگا کے ترائی کے خربوزوں، تربوز، قائم گنج کے آم اور بیروں کے ذائقہ کو ذرا سے فرق سے بھی پہچان جاتے تھے۔

محمد مبین خاں صاحب شاہ عبدالقادر دہلوی کے قرآن مجید کا ترجمہ ان سے پڑھوا کر سنتے تھے اس سے یقیناً یوسف صاحب کو بہت فائدہ پہنچا۔ ناظرہ قرآن شریف تو سب مسلمان پڑھتے ہیں۔ لیکن معنی اور مطالب سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اردو ترجمہ اگر وہ خود بھی پڑھ لیتے تو شائد قرآن فہمی میں زیادہ آگے نہ بڑھ سکتے۔ کسی بزرگ کو سنانے میں فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پوری توجہ سے پڑھنا پڑتا ہے کہیں رکاوٹ ہو تو بزرگ اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس قرآن فہمی کا انہیں آگے چل کر بہت فائدہ ہوا۔ اردو شاعری کے عناصر میں روحانیت اور تصوف کو سمجھنے اور خاص طور پر اقبال کے ہاں قرآنی مفاہیم تلاش کرنے اور ان کی تشریح کرنے میں انہیں آسانی ہوئی ہے۔ اس لیے شاید روح اقبال اقبالیات میں سب سے اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

اسی طرح قائم گنج کے بہت سے اور کرداروں کی چلتی پھرتی منہ بولتی تصویریں انہی صفحات پر ہمیں ملتی ہیں۔ جس سے بھلے ہی یوسف صاحب راست طور پر متاثر نہ ہوئے ہوں مگر جن کی بعض خصوصیات سے انہیں انسانوں کو سمجھنے اور پرکھنے میں بڑی مدد ملی۔ یہیں انہوں نے مختلف قصباتی کھیلوں اور مشاغل میں تھوڑی بہت

دلچسپی لی۔ یہ مشاغل ان کے زمانے میں صرف قصبات میں باقی رہ گئے تھے۔ حالانکہ ایک زمانے میں دہلی اور لکھنو میں ان کا سکہ چلتا تھا۔ ان ہی صفحات میں اپنے تینوں مرحوم بھائیوں مظفر حسین خاں، عابد حسین خاں اور زاہد حسین خاں کی بڑی محبت اور دلسوزی سے تصویر کشی کی ہے۔ اپنے دادا کی جلالی طبیعت اور نانا کی جمالی اور مرنجاں مرنج طبیعت کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ان دونوں کی طبائع کا ورثہ انہیں اور دوسرے بھائیوں کو بھی کسی کو کم کسی کو زیادہ ملا ہے۔ بڑی بھاوج کی محبت شفقت کا بھی ذکر ہے کہ قائم گنج کے گھر میں ماں کی سی جھلک ان ہی میں نظر آئی۔ قائم گنج کے کھانوں، رسم ورواج، لڑائی جھگڑوں، عورتوں اور مردوں سب کا ذکر وہ اس قدر دھیمے مگر فطری اور پرلطف انداز میں کرتے ہیں کہ ہم اس ماحول کو محسوس کر سکتے ہیں جن میں ان کی شخصیت پروان چڑھی۔

سات بھائیوں میں سے چار بھائی تو زمین کی گود میں جاسوئے تھے جو تین رہ گئے تھے ان میں اپنے علاوہ چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمود حسین خاں سابق وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی کا جو ان کے سمدھی بھی ہیں ذکر وہ اسی باب میں کرتے ہیں جو صاحب ذوق اور تند خو تھے۔

یوسف صاحب اپنے سب سے چہیتے مشہور زمانہ اور مدہ آخوں کے خاندان اور قائم گنج کو ہندوستان کی تاریخ کا حصہ بنا دینے والے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین کے لیے پورا چوتھا باب فخر خاندان کے عنوان سے مختص کر دیا ہے۔

یوسف صاحب نے اپنے محبوب بھائی کے لیے میر کے کلام سے ایک ایسا شعر چنا ہے جس کے ذریعہ اپنے بھائی کو خراج عقیدت نہیں پیش کرتے بلکہ پڑھنے والے بھی اس پر صاد کرتے ہیں ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے بنے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

سچ ہے سب انسان خاکی ہوتے ہوئے بھی فخر روزگار ایک ہی آدمی ہوتا ہے جو قوم کی آنکھوں کا تارا ہوتا ہے جس کی شخصیت اور زندگی محبت، محنت، دل سوزی اور جاں سپاری سے عبارت ہوتی ہے۔

ذاکر صاحب کا ذکر آئے تو یہ ممکن نہیں کہ بات صرف ان کی ذات سے شروع ہو کر ان ہی کی ذات پر ختم ہو جائے۔ وہ ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جن کی زندگی کے آئینہ میں پورے ہندوستان کی تصویر منعکس تھی۔ وہ علی گڈھ کے طالب علم بھی تھے۔ طلباء اور جامعہ کے لیے ایسی معتبر شخصیت تھے جس پر دونوں کو اعتماد تھا۔ جامعہ ملیہ قائم ہوئی تو وہ بھائی سمیت وہاں منتقل ہو گئے۔ جامعہ ملیہ کا قیام خود انگریزی عملداری کے خلاف اپنی ذات پر بھروسہ کا اعلان تھا۔ بے سروسامانی کے زمانے میں اپنے عزم جواں کا اعلان تھا۔ تحریک ترک موالات، ہندوستان کی سیاسی اتھل پتھل، محمد علی، شوکت علی، گاندھی جی، مولانا محمود الحسن اور حکیم اجمل خاں ان ساروں کا ذکر بھی ذاکر صاحب کے ساتھ ساتھ ہونا ضرور تھا اور یہ بڑے نام ہی نہیں بلکہ وہ سارے لوگ جو جامعہ کی تحریک یا ہندوستانی سیاست سے وابستہ تھے ان سب کا ذکر بھی ذاکر میاں کے ساتھ آنا ضروری تھا۔ یوسف صاحب ذاکر صاحب کی طرح عملی سیاست کے آدمی نہ تھے لیکن وہ اس وقت بھی ساری فضا کو محسوس کرتے اور پہچانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے بڑی تفصیل سے ان سارے واقعات کا ذکر کیا ہے جو ہر باشعور انسان پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ مختلف مشاہیر کا تعارف اور تذکرہ جس طرح ان کی تحریر میں آیا ہے وہ آج کی نسل کے لیے دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔

ذاکر صاحب ۱۹۲۲ء میں جرمنی گئے تقریباً ساڑھے تین سال وہاں رہے حالانکہ ان کا مضمون معاشیات تھا جس میں برلن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کی لیکن فلسفہ تعلیم جس کی طرف ان کا ہمیشہ رجحان رہا اس میں بھی انہوں نے جرمنی کے دوران قیام بہت کچھ حاصل کیا اور میدان تعلیم کے امامان وقت سے استفادہ کیا۔

جس کا بہت زیادہ فائدہ ہندوستان کے نظام تعلیم کو پہنچا۔ جرمنی ہی میں ان کے دوستانہ مراسم کچھ انقلابیوں سے قائم ہوئے اور عملی سیاست کی طرف وہ مائل ہوئے۔ وہ برلن میں ہندوستانی طلباء کی انجمن کے صدر تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی اور گاندھی جی پر جو تقریریں جرمن زبان میں کی تھی وہ گاندھی جی کی جرمن تقریروں کے ترجمے کے ساتھ شائع ہوئیں۔

ذاکر صاحب ہمیشہ سے دماغی کام کے لیے ہاتھ کے کام کو ضروری سمجھتے تھے۔ ذاکر میاں نے جرمنی میں کاویانی پریس میں کمپوزنگ سیکھی اور اتنی مہارت حاصل کی کہ دیوان غالب کو خود کمپوز کیا۔ حسن طباعت نے اس کی قدور قیمت اور بڑھادی سرورق کے ساتھ جرمن مصور کی بنائی ہوئی غالب کی ایک تصویر بھی ہے۔ ذاکر صاحب نے غالب کو پڑھ کر اپنے خیالی پیکر کو تراشا تھا۔ جسے جرمن مصور نے رنگوں اور خطوں سے ایسا بنادیا کہ آج وہی غالب کی اصلی تصویر معلوم ہوتی ہے۔

جرمنی سے ذاکر صاحب ۱۹۲۶ء کے آغاز میں جب واپس ہوئے تو جامعہ کے پرنسپل بنائے گئے۔ مولانا محمود الحسن نے جس کی بناء ڈالی تھی مولانا محمد علی نے اسے سنبھالا تھا اور حکیم اجمل خاں اس کے پہلے امیر جامعہ بنے۔ مولانا محمد علی جامعہ کے پہلے پرنسپل تھے۔ ان کے گرفتار ہونے کے بعد عبد المجید خواجہ نے اس کام کو سنبھالا۔ ذاکر صاحب آئے انہوں نے اس منصب کو اپنے ذمے لیا۔ حکیم اجمل خاں کے ساتھ کام کیا اور ایسا کیا کہ حکیم اجمل خاں کے دست غیب سے حاصل ہونے والی امداد جو انکے اثر و رسوخ کا نتیجہ تھی اس کے ساتھ ذاکر صاحب کی بے نفسی، ایثار، محنت اور جفاکشی نے مل کر گویا جادو کا کام کیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری شروع ہی سے جامعہ سے وابستہ تھے۔ حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد دست غیب والی آمدنی بند ہو گئی تو جامعہ کو چلانا مشکل تھا۔ امنائے جامعہ سے مشورہ کیا گیا تو مالیہ کی کمی کی وجہ سے ہر ایک نے اسے بند کرنے کا مشورہ دیا۔ اس وقت ذاکر صاحب نے اپنے رفیقوں کو اس بات پر

آمادہ کیا کہ بلا معاوضہ کام کریں پھر طرح طرح انہوں نے اس کے مالیہ کی فراہمی کی کوشش کی مگر کئی سال تک یہ حال تھا کہ بلا معاوضہ نہ ہی بعد میں نہایت قلیل معاوضہ پر ان رفیقوں نے کام کیا اور جامعہ کو زندہ رکھ کر اپنے خلوص، حوصلے، عزم جواں کا ثبوت دیا۔ نیت بخیر ہو تو خدا مدد کرتا ہے۔ ہمدردان جامعہ کا ایک بڑا حلقہ بنالیا۔ بچوں کے ادب اور بالغوں کی تعلیم کی اہمیت کو سمجھا اور سمجھایا اور ان کے لیے نئی راہیں نکالیں۔ دین کے ساتھ دنیا سنوارنے کا بھی اہتمام کیا۔ تعلیم کے ساتھ کھیل کے میدان پر بھی توجہ دی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ طالبوں کو ایک اچھا انسان بنانے کا ارادہ کر لیا۔ علی گڈھ سے لے کر اوکھلے میں جامعہ کی مستقل عمارتوں تک ذاکر صاحب نے انتھک کوشش کی جس کا اندازہ آج لگانا مشکل ہے۔ جامعہ ملیہ کے مقصد کے متعلق ذاکر صاحب نے اپنے خطبات میں وضاحت کی تھی۔

> " جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔" (۷)

اس مقصد کو انہوں نے جامعہ میں ہمیشہ پیش نظر رکھا اور جس دن جامعہ اس مقصد سے ذرا بھی ہٹی اس کی ساخت متاثر ہو گئی وہ ہندوستانی مسلمانوں کی شناخت باقی رکھتے تھے۔ انہیں ہندوستانی قومیت میں جذب کرنا چاہتے تھے۔ ان کے یہ اقتباسات آج بھی موجودہ صورت حال میں دعوت غور و فکر دیتے ہیں۔

> ۔ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود

غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح
تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید
شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت
مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور
مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی
نہیں اور میں بہ حیثیت مسلمان ہی نہیں سچے
ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ
مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس
لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا
ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں
پہونچ جائے گا۔۔۔۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا
دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی
قوم کا جز ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر وہ ایسا جز بننا
کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت
بالکل مٹ چکی ہو۔" (۸) (خطبات۔ صفحہ ۲۵)

یوسف صاحب نے ذاکر صاحب کے خطبات کو ذرا تفصیل سے پیش کیا ہے تاکہ ان کے فلسفہ، تعلیم، اسلامیت اور قومیت سب کے بارے میں ذاکر صاحب کے خیالات کی وضاحت ہو جائے اور ذاکر صاحب کے طرز فکر کو جانچا جا سکے۔ وہ صداقت اور جرات کا پیکر بھی تھے اور بے حد اخلاق والے انسان بھی۔ ان کی نیت صاف تھی۔ اسی لیے ان کے بڑے سے بڑے دشمن نے بھی ان کی قوم پرستی پر شبہ نہیں کیا۔ بچوں کے ادب کے سلسلے میں وہ بے حد فکر مند تھے۔ جامعہ سے پیام تعلیم نکالا اور بچوں کا ایک معیاری رسالہ اردو والوں کے سامنے پیش کیا۔ اس رسالے کے ذریعے بچوں

کے بہت سے ادیب ابھرے ۔خود انہوں نے رقیہ ریحانہ کے نام سے کہانیاں لکھیں جو بچوں کی فطرت اور دلچسپی کے عین مطابق تھیں ۔زبان میں سلاست اور روانی تھی ۔ ابو خاں کی بکری ان ہی کہانیوں کا مجموعہ ہے جو بعد میں ذاکر صاحب کے نام سے شائع ہوا اسی طرح بچوں کے لیے ان کی دوسری کتاب کچھوا اور خرگوش ہے ۔یوسف صاحب نے ذاکر صاحب کی تحریر کے لیے بالکل سچ کہا ۔۔

" ذاکر میاں کے طرز تحریر میں خلوص کے ساتھ جوش اور ولولہ ، تازگی اور قوت ہے جو ان کی شخصیت کا عطیہ ہے ۔انہیں جو کہنا ہے اسے بالکل فطری انداز میں کہتے ہیں ۔" (۹)

ذاکر صاحب جب ایم ۔اے ۔او کالج میں طالب علم تھے تب ہی انہوں نے افلاطون کی ریاست کا اردو ترجمہ کیا تھا ۔وہ بیک وقت مترجم ، خطیب و مقرر ، نظام تعلیم کو مرتب کرنے والے ، کانفرسیں منعقد کرنے والے انسان دوست اور یونیورسٹیز کے بہترین چلانے والے ۔جب تک وہ جامعہ یا علی گڈھ میں رہے لکھتے پڑھتے تعلیمی کام میں لگے رہے ۔وہ گویا اپنی فطری دنیا میں جیتے رہے لیکن جب سیاست نے انہیں گورنری اور صدارت کے لیے گھسیٹ لیا تو ان کا حال اس مچھلی جیسا تھا جو پانی سے الگ کر دی گئی ہو ۔سیاست کی اپنی بندشیں ہوتی ہیں ۔وہاں عالم زیادہ کام نہیں کر سکتا اور خاص طور پر آج کی سیاست میں ۔اس لیے ان کے بہی خواہوں کو اکثر افسوس رہا کہ ذاکر صاحب اور ابو الکلام آزاد نے سیاست میں الجھ کر قلم رکھ دیا اور کرسی پر بیٹھ گئے ۔یوسف صاحب نے اس پر کھل کر کچھ نہیں کہا ۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اعلیٰ مناصب ان کی خدمات کا اعتراف بھی تھے اور ہندوستانی مسلمانوں کو ڈھارس بندھانے والے بھی ۔

ذاکر صاحب کی سیرت کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک قلندر مزاج صوفی حسن شاہ کا

ذکر کیا ہے جو ان کے دادا کے دور کے عزیز تھے۔ان کی طبیعت میں جذب کی کیفیت بھی تھی مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔وہ ذاکر میاں سے اکثر تصوف کی کتابیں پڑھوا کر سنتے اور بعض کتابیں نقل کرواتے۔اس بہانے ذاکر صاحب کی طبیعت میں ایک قسم کی درویشی اور صوفیانہ پن پیدا ہوگیا تھا۔کتابیں نقل کرواتے کرواتے وہ مسائل تصوف کو سلجھاتے بھی تھے۔اس طرح وہ تصوف کی اعلیٰ قدروں سے روشناس ہوئے۔وہ ذاکر صاحب کو روپیے دیتے اور محتاجوں اور بیواؤں میں ان کے ہاتھ سے تقسیم کرواتے اس سے دل فراخ اور حوصلہ وسیع ہوا۔یوسف صاحب نے ان کے میلانات اور رجحانات پر لکھتے ہوئے ان کے شوق و مشاغل کا بھی ذکر کیا ہے۔

"ذاکر میاں کے تفریحی مشاغل کتب بینی کے علاوہ
دو ہیں۔باغبانی اور پرانے پتھر جمع کرنے کا شوق۔(۱۰)

اس کا ثبوت یہ ہے کہ علی گڈھ یونیورسٹی کو انہوں نے اپنے دوران قیام گلستان میں تبدیل کر دیا اور ان کا یہ شوق دوسروں میں بھی سرائیت کر گیا۔پٹنہ کے گورنر ہاؤس اور دہلی میں وائس پریسڈنٹ کی کوٹھی میں گلاب کی بے شمار قسمیں ان ہی کی یادگار ہیں۔اس طرح ان کے پتھروں کا شوق ہے جس کا ذخیرہ دیکھنے کے قابل ہے۔

ضیاالحسن فاروقی ذاکر صاحب کے اسی شوق کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"کسی نے ان سے پوچھا کہ خوب ڈرائنگ روم میں
رکھنے کے لئے آپ کو کوئی اور چیز نہیں ملی کہ آپ
نے ان پتھروں کو جمع کر لیا ہے"؟ ذاکر صاحب کے
اندر ایک معلم اور ایک مہذب انسان کی روح
نے کروٹ لی اور پھر انہوں نے کہا

جی ہاں ، ان پتھروں سے بہتر دنیا میں اور کیا چیز مل سکتی ہے ، یہ نہ کسی کو دھوکا دیتے ہیں ، نہ کسی کی چغلی کھاتے ہیں ، نہ کسی سے دشمنی کرتے ہیں نہ کسی کا حق مارتے ہیں ، نہ اپنی اصلیت کو چھپاتے ہیں ، نہ کسی کا پردہ فاش کرتے ہیں اور نہ کسی سے نفرت ۔ فرمائیے اب بھی آپ کو میرے ان پتھروں سے نفرت ہے ؟ " (۱۱)

یوسف صاحب نے ذاکر صاحب کے جامعہ کے ساتھیوں کا ذکر کیا ہے جو ایثار ، قربانی اور مقصد کی لگن رکھنے میں ذاکر صاحب کے شانہ بہ شانہ رہے ۔ ان میں پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین نے علمی ادبی دنیا میں بہت نام کمایا ۔ غرض یوسف صاحب نے ذاکر صاحب کی زندگی کے ہر پہلو کو ، صفحات میں سمیٹا ہے ۔ ان کی نجی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے ان کے عمدہ اخلاق اور پاک صاف متاہلی زندگی کا ذکر بھی کیا ہے اور آخر میں انہیں فخر خاندان ہی نہیں فخر قوم کہا ہے یوسف صاحب اپنے اس بھائی پر جتنا ناز کریں کم ہے ۔

" ہمیں اس بات پر بجا طور پر فخر ہے کہ یہ چراغ جس سے بہت سی انجمنیں روشن ہیں ہمارے گھر کا چراغ ہے ۔ " (۱۲)

یہاں ایک بات کا ذکر گستاخی نہ سمجھا جائے گا کہ رشید صاحب نے جو ذاکر صاحب کے علی گڈھ کی طالب علمی کے زمانے کے دوست تھے اپنی کتاب ذاکر صاحب اور دیگر مختلف مضامین میں ان کا جس والہانہ انداز میں شیفتگی اور فخر کے ساتھ ذکر کیا ہے وہ چیزے دیگر است ۔ وہاں ایک عاشق دوست کا دل بولتا ہے اور یوسف صاحب کی کتاب ایک محتاط اور باادب اور سنجیدہ چھوٹے بھائی کا قلم ہے اور شاید یہ بھی ہو کہ وہ بہت لکھنا چاہتے ہوئے بھی وہ اس لیے سنبھل کر لکھ رہے ہوں گے کہ زیادہ مدح کہیں مدح خود نہ بن جائے ۔ لوگ کہیں گے کہ انہوں نے شخصی تعلقات اور قریبی قرابت کی وجہ سے تعریف کی ہے ۔ مگر اس کی ہر سطر سے یہ بات جھلکتی ہے کہ

وہ ذاکر میاں کے بھائی ہونے کی وجہ سے اس قدر مسرور ہیں۔

یادوں کی دنیا کے پانچویں باب میں یوسف صاحب نے اپنی جامعہ کی زندگی کی تفصیل لکھی ہے۔ جب یوسف صاحب قائم گنج میں مقیم تھے تو وہاں سے برابر علی گڈھ ذاکر میاں سے ملنے کے لیے جاتے تھے اور جس دن جامعہ کا قیام عمل میں آیا تو یہ وہیں موجود تھے۔ جب ان کی صحت ٹھیک ہوئی تو ذاکر میاں کے مشورے سے یوسف صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی محمود حسین خاں دونوں ۱۹۲۱ء میں جامعہ میں داخل ہوگئے۔ محمود میاں بہت چھوٹے تھے اس لیے اسکول میں اور یہ پریلمنری کلاس میں داخل ہوئے جو آج کی پری یونیورسٹی کی طرح تھی۔ یوسف صاحب اس واقعہ کو اپنی زندگی کا اہم ترین واقعہ سمجھتے ہیں۔ یہاں بھی انہوں نے اپنی صحت کا خیال رکھا۔ صبح سویرے کی ہواخوری نہ چھوڑی۔ اس میں وہ اکثر تنہا ہوتے تھے۔ کمرہ بھی ہوادار تھا مگر قائم گنج سا کھانا علی گڈھ میں کہاں میسر ہوتا۔ وہاں دودھ دہی کی افراط تھی اور گھر کا لذیذ کھانا۔ علی گڈھ کے کھانے سے پھر کچھ علیل ہوئے اور ذاکر صاحب کا خط لیکر دہلی ڈکٹر انصاری کے پاس گئے۔ ڈاکٹر انصاری کا حال "گنجہائے گرانمایہ" میں رشید احمد صدیقی نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ کس طرح وہ مریضوں میں اعتماد بحال کرتے اور مریض ان کے مشورے سے بے فکر ہو کر بدپرہیزی پر اتر آتا۔

> "ڈاکٹر انصاری سے رخصت ہو کر اپنے آپ کو بالکل تندرست سمجھنے لگتا۔ مرض کی کچھ تکلیف بھی ہوتی تو سمجھتا کہ دوا استعمال کرنے کے بعد جاتی رہے گی۔ چنانچہ مطب سے اترتے ہی فتحپوری اور چاندنی چوک کی چہل پہل اور ہماہمی میں گم ہوجاتا۔ پھل والوں سے پھل خریدتا اور کسی ہوٹل میں جاکر کھانا کھاتا۔ مدتوں پرہیز کرتے کرتے کھانے پینے کا

جو لطف کھو چکا تھا اس کی بد پرہیزی سے از سر نو
حاصل کرتا ۔ دل کا اندوہ چھٹ جاتا اور زندگی
خوش گوار اور خوش آئند معلوم ہونے لگتی ۔" (۱۴)

قدرت نے انہیں مسیحائی کا وصف بخشا تھا۔یوسف صاحب کا تجربہ بھی یہی تھا انہوں نے یقین دلایا تھا کہ بیماری کوئی نہیں نسخہ میں ایک ٹانک لکھ دی اور دو طرح کی گولیاں کچھ مہینے انہیں استعمال کرنے کو کہا پھر آنے کو کہا مگر اس کی ضرورت ہی نہیں ہوئی ۔جامعہ میں نماز کی پابندی ہوتی تھی ۔یوسف صاحب نے بھی جامعہ میں پنج وقتہ نماز کی پابندی کی اور کبھی فجر کی نماز قضاء نہ ہوئی ۔

یہ وہی زمانہ تھا جب ملک میں ترک موالات اور تحریک خلافت کا دور دورہ تھا ۔انہوں نے بھی خالص کھدر پہننا شروع کر دیا ۔لیکن یورپ جانے کے بعد اس کا استعمال ترک ہوگیا ۔واپس آکر وہ ہندوستان میں بنا ملوں کا کپڑا پہننے لگے ۔وہ بھی ہندوستانی صنعت کے لیے فائدہ مند تھا ۔اس زمانے میں ان کے جو ساتھی تھے ان میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے کیونکہ جامعہ میں کوئی تفریق نہ تھی ۔ان ساتھیوں کو وہ اپنی کتاب کے صفحات میں یاد کرتے ہیں لیکن ایسے لگتا ہے کہ یہ سب ساتھی اور ملاقاتی تھے ان میں کوئی خاص دوست نہ تھا ۔ممکن ہے کہ ان کی تنہائی پسند طبیعت کسی کو اپنا گہرا دوست اور راز دار بنانے میں مانع آتی تھی ۔

انہوں نے اپنے تمام استادوں کا ذکر بھی کیا ہے ۔ان میں ایک سے ایک لائق استاد تھے ۔ مولویوں میں کوئی کٹر مولوی اور پایہ کے عالم بھی اور مولانا اسلم جیراجپوری جیسے دلکش شخصیت کے مالک بھی ۔جامعہ کے ماحول میں دینی تعلیم بھی تھی اور روشن خیالی بھی ۔اس لیے جامعہ کے طالب علموں میں بھی توازن اور اعتدال تھا حالانکہ بعض مولوی بے حد کٹر تھے ۔طالب علم ان اساتذہ سے بحث کرتے نہ چوکتے ۔ یوسف صاحب نے اسی ضمن میں دین کے بارے میں اپنے مسلک کو بیان کیا ہے ۔

"میں سمجھتا ہوں دین کی معنویت اس قسم کی فقہی
سخن سازی سے کہیں زیادہ بلند چیز ہے جس سے
روح کی تہذیب ہوتی ہے ۔" (۱۴)

بعض کے ذکر میں کہیں ہلکے مزاح سے کام لیا ہے اور بعض کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا ہے ۔ انگریزی کے استاد کیلاٹ صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہوں نے اعتراف کیا ہے ۔

"ادب اور آرٹ دونوں کا مقصد اثر پذیری ہے اور
یہ مقصد ہم لوگوں نے پوری طرح سے حاصل کیا ۔
کیلاٹ صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہم
سبھوں میں یہ ذوق ابھارا اور اس کے نشو و نما میں
مدد دی ۔ اگر استاد یہ کام کردے تو پھر اس سے
زیادہ کچھ اور نہیں چاہئے ۔ اگر وہ شاگردوں کو
راستے پر ڈال دے تو پھر خود آگے بڑھتے ہیں
۔۔۔۔۔۔۔۔۔ استاد کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے
شاگردوں کے اندرونی قویٰ کو حرکت میں لائے
تاکہ ان کی روح کے سوت کھل جائیں ۔ اگر ایسا
ہو جائے تو شاگرد اس سوت سے اپنی ذہنی زندگی کو
خود ہی شگفتہ اور شاداب بنالیں گے ۔" (۱۵)

اس سے اندازہ ہوتا ہے یوسف صاحب جو بعد میں چل کر خود بھی استاد بنے ایک اچھے استاد کا کیا معیار قرار دیتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ آج یونیورسٹیز کی جو حالت ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ مولانا اسلم جیراجپوری اور کیلاٹ صاحب جیسے استاد ناپید ہیں ۔ یوسف صاحب نے ان استادوں کی خوش خلقی ، علمیت ، رواداری اور

انسان دوستی اور سب سے بڑھ کر اپنے پیشے سے شغف کو سراہا ہے۔ اپنے آخری دور میں انہیں افسوس ہوتا ہے۔

"استادوں کی دلچسپی کا مرکز طالب علم نہیں رہے بلکہ ذاتی مفاد یا گروہ بندی کی سیاست ان کی تمام تر توجہ کو جذب کر لیتی ہے۔ سیاست بازی کا جب آسان نسخہ موجود ہے تو مشقت کر کے اپنی قابلیت بڑھانے اور اس طرح اپنی علمی حیثیت منوانے کی کیا ضرورت ہے۔" (۱۶)

جامعہ جب دہلی منتقل ہوئی تو ذاکر صاحب بھی قرولباغ میں رہنے لگے۔ اسی زمانے میں اپنے استاد کیلاٹ صاحب اور ساتھیوں کے ساتھ اوکھلا دیکھنے گئے۔ کیلاٹ صاحب تعلیم کے ساتھ ساتھ طالب علموں کو صحت مند دیکھنا چاہتے تھے اور تفریح کرانا بھی۔ چنانچہ اوکھلا سے قریب جمنا میں جب سب تیرنے لگے چودھری اکبر کے کہنے پر یوسف صاحب بھی تیرنا سیکھنے کے لیے اترے اور دو تین غوطے کھا گئے۔ چودھری صاحب نے بچا لیا مگر یوسف صاحب کے دل میں ایسا ڈر بیٹھ گیا کہ پھر کبھی کوشش نہیں کی۔ یورپ میں بھی سمندر سے قریب ساحل کے تماشائی بنے رہے۔

جامعہ کو ترقی ہوئی تو مکتبہ جامعہ کا قیام عمل میں آیا۔ پہلے چودھری اکبر علی اس کے بعد حامد علی خاں اور پھر غلام ربانی تاباں جو یوسف صاحب کے برادر نسبتی تھے مکتبہ جامعہ میں رہے اور اسے خوب ترقی ہوئی۔

جامعہ میں جو نیا نصاب محمد علی کا بنایا ہوا تھا رائج کیا گیا اس میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں صنعت و حرفت کو لازمی قرار دیا گیا تاکہ طالب علم اپنی روزی کمانے کے قابل ہو سکیں۔ اس نصاب میں قدیم اور جدید دینی اور دنیوی تعلیم کا اچھا امتزاج تھا۔ یہ جامعہ حکومت کے اثر سے بالکل آزاد رہ کر تعلیم عام کرنا چاہتی تھی۔ چونکہ

آزادی کی تحریک سے جامعہ کا جنم ہوا تھا اس لیے یہاں کے طالب علموں میں سے اکثر سیاست میں داخل ہو گئے۔

جامعہ کا پریس قائم ہوا۔ رسالہ جامعہ کی وجہ سے طالب علموں اور استادوں کی تحریریں آسانی سے چھپنے لگیں۔ اور ان میں سے اکثر نے نام کمایا۔ یورپ جانے سے پہلے یوسف صاحب رسالہ جامعہ کے کچھ عرصہ مدیر رہے۔ یوسف صاحب کی بہ حیثیت ادیب ابتدائی تربیت رسالہ جامعہ ہی کے ذریعے ہوئی۔

جامعہ کے استادوں کے ایثار اور محبت ان کے خلوص اور سادہ زندگی سے وہاں کے طالب علموں پر اچھا اثر پڑا۔ جب سے جامعہ قائم ہوئی اقامتی زندگی کا طریقہ بھی رائج رہا جس نے طالب علموں کے کردار سازی میں بڑا حصہ لیا۔

جامعہ کے ساتھیوں میں یوسف صاحب نے شفیق الرحمن قدوائی کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے اور اس مرد مومن کو یہ کہہ کر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

"ان کی خلوت و جلوت یکساں تھی۔ قول و فعل میں
تضاد نہ تھا۔ ان کی بات پر ہر شخص کو پورا اعتماد تھا
وہ صداقت اور مروت کا پیکر مجسم تھے۔" (۱۷)

ان سے اور ان کی اہلیہ سے یوسف صاحب کے مراسم جامعہ کے بعد بھی قائم رہے طالب علمی کے زمانے میں ان کے ساتھ نے یوسف صاحب پر بہت اچھا اثر ڈالا۔

ہندو مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے والی شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں اور اس کے جواب میں تبلیغ اور مسلم تنظیم کی تحریکیں ۱۹۲۴ء میں ایسی چلیں کہ ملک میں فسادات ہونے لگے۔ گاندھی جی نے مولانا محمد علی کے مکان پر ان فسادات کو ختم کرنے کے لیے برت رکھا۔ حالات کچھ سدھرے مگر ایک قوم دو قوموں میں بٹ گئی اور دلوں میں گرہ پڑ گئی۔

جامعہ اپنے ابتداء ہی سے کانگریس سے قریب تھی اور اس کے طالب علم

کانگریس کے جلسوں میں جایا کرتے تھے۔ یوسف صاحب بھی ان جلسوں میں شرکت کرتے رہے۔

جامعہ میں بزم اتحاد کی وجہ سے طالب علموں میں تقریر کی صلاحیت بڑھی۔ جہاں اچھے مقرر مدعو کیے جاتے اس کے جلسے بڑے اہتمام سے ہوتے بعض مقررین کو سننے کا ہمیں موقع ملا۔ بزم اتحاد میں اقبال کا کلام بڑے شوق سے پڑھا اور سنا جاتا تھا۔ یوسف صاحب اور محمود صاحب دونوں بھائی جب کشمیر گئے تو واپسی میں خاص طور پر اقبال سے ملنے کے لیے لاہور گئے۔ وہ یہ سن کر بہت متاثر ہوئے کہ یہ دونوں محض ان سے ملنے کے لیے لاہور آئے بڑی اچھی طرح ملے اور مولانا محمد علی کے بارے میں بات کرتے رہے۔ اس وقت یوسف صاحب ایک نو عمر اور نو پختہ طالب علم تھے۔ عقیدت کا اظہار کر کے چلے آئے۔ لیکن بارہ سال بعد ۱۹۳۷ء میں جب لاہور میں انڈین ہسٹوریکل ریکارڈ کمیشن کا اجلاس ہوا اور یوسف صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے وہاں گئے تو اقبال سے تفصیل سے گفتگو کرنے اور فیض اٹھانے کا موقع ملا۔

کتاب کا چھٹا باب "دیار فرنگ" کے عنوان سے ہے۔ پانچ سال جامعہ میں گزارنے کے بعد جب وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ روانہ ہوئے تو جامعہ کے فیض نے انہیں بڑا خود اعتماد بنادیا تھا۔ یوسف صاحب نہ سخت کوش گئے جرمنی جہاں ذاکر صاحب گئے، نہ کلف زدہ انگلستان گئے جہاں عام طور پر ہندوستانی طالب علم جاتے تھے یا تو مرعوبیت کا شکار ہوتے تھے یا بغاوت کا۔ یوسف صاحب گئے تو ۱۹۲۶ء میں فرانس گئے تھے۔ جہاں زبان میں موسیقی تھی، چال میں تیزی اور حسن و جمال نسوانی کی فراوانی۔۔۔

> "ایسا باغ و بہار حسن اپنی زندگی میں پہلے کبھی
> نہیں دیکھا تھا۔ جنوبی فرانس کی عورتیں نہایت

حسین ہوتی ہیں ۔ ان کے حسن میں مجھے کچھ
مشرقیت محسوس ہوئی رنگ گورا، آنکھیں اور بال
سیاہ، قد بوٹا سا، لڑکیاں اور بعض ادھیڑ عمر والیاں
بھی رخساروں پر غازہ اور ہونٹوں پر روژ لگاتی ہیں،
جس سے ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے ۔ عام طور پر
تیز چلتی ہیں جیسے کوئی بڑی مصروفیت میں، ہو یا شاید
ان کی چال کا انداز ہی یہ ہو بقول داغ ؎

ٹھہر گئے وہ جہاں سرو باغ تھے گویا
اگر چلے تو نسیم بہار ہو کے چلے (۱۸)

جانے سے پہلے تھوڑی فرانسیسی سیکھ لی تھی اور سمجھتے تھے کہ کسی طرح کام چل جائے گا لیکن وہاں جا کر دیکھا کہ از سرِ نو سیکھنا پڑے گا ۔ خاص طور پر لب و لہجہ ۔ وہ اکثر قہوہ خانوں کے سامنے جیسے کہ پیرس میں عام طور پر ہوتا ہے بیٹھ جاتے تھے حسن رواں کا نظارہ کرتے ۔ وہاں مئی کا موسم بہار ہے اور حسین لڑکیوں کو MAY QUEEN بنایا جاتا تھا ۔ یوسف صاحب نے دل کھول کر حسن فطرت اور حسن نسواں دونوں سے آنکھیں ٹھنڈی کر لیں اور ان دو تین صفحات میں جو اپنے دل کی کیفیت بیان کی ہے اور قلم سے جو سرشاری ٹپکتی ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ان جیسے خول میں بند نظم و ضبط کے پابند انسان کا دل بھی ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے ۔

وہ تولون کی بندرگاہ پر اترے تھے اور پیرس جانے کے لیے وہاں کی سب سے مہنگی ٹرین واگون لی (خواب گاڑی) کا ٹکٹ لیا اور وہ بھی بھولے سے اور سفر کا آرام و لطف اٹھایا ۔ پیرس میں انہوں نے افتخار علی کو لکھ دیا تھا جو وہاں زرین کپڑوں کا کاروبار کرتے تھے ۔ وہ پہلی ملاقات ہی میں بے تکلف ہو گئے ۔ انہیں اپنی دوکان کے قریب ایک ہوٹل میں ٹھہرایا اور اسی دن ڈاکٹر انصاری کے بھانجے شوکت اللہ شاہ سے

ملوایا جو کالج میں پڑھتے تھے اور ایک فرانسیسی خاندان کے ساتھ رہتے تھے ۔ چنانچہ ایک خاندان سے معاملہ طئے ہوگیا ۔ موسیو تریو، بیٹی، داماد اور نواسہ نواسی کے ساتھ رہتے تھے ۔ کھانے کے بعد ان کی بیوی فرانسیسی پڑھاتیں اور یوسف صاحب بچوں سے باتیں کرتے اور اپنی فرانسیسی سنوارتے ۔ وہ ایک سال تک فرانسیسی سیکھتے رہے پھر ایک اسکول ٹیچر سے فرانسیسی کتابیں پڑھیں اور دلچسپی اتنی بڑھی کہ اہم ادیبوں کی تقریباً ساری کتابیں پڑھ ڈالیں اور خود فرانسیسی ادب کی لگ بھگ دو سو کتابیں جمع کر لیں ۔

مئی میں وہ پیرس پہنچے تھے اکتوبر میں پیرس سوربوں یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لیے داخلہ لیا ۔ فرانس میں اعلیٰ تعلیم بھی مفت تھی چونکہ آنے جانے میں زیادہ وقت لگتا تھا اس لیے یونیورسٹی کے قریب ہی ایک کمرہ کرایہ پر لیا وہاں کھانا بھی گراں نہیں تھا ۔ اپنے موضوع کے علاوہ وہ فلسفہ، تاریخ یورپ، تاریخ تہذیب، فرانسیسی ادب و تہذیب کے لکچر بھی اٹنڈ کیا کرتے تھے ۔ ان کی یہی ہمہ گیر دلچسپی اور ادبی کتابوں کے مطالعے کی وجہ سے فرانسیسی زبان پر مہارت بھی حاصل ہوئی اور ادب کی سوجھ بوجھ بھی پیدا ہوئی جو بہت سالوں بعد فرانسیسی ادب کے بارے میں کتاب لکھنے میں معاون ثابت ہوئی ۔

یوسف صاحب وہاں ہندوستانی طالب علموں کی انجمن کے دو سال تک سکریٹری بھی رہے ۔ راس مسعود سے وہیں ملاقات ہوئی اور دوسرے بڑے ہندوستانیوں سے بھی اسی انجمن کے ذریعے ملے ۔ انہوں نے سوربون کی تاریخ بیان کرتے ہوئے وکٹر ہیوگو کے مشہور ناول " ناتردام کا کبڑا " کی مرکزی علامت کے بارے میں بھی لکھا ہے ۔ سوربون کی یونیورسٹی میں انسان دوستی کا مسلک مقبول تھا ۔ یونانی اور لاطینی ادب عالیہ کا ترجمہ فرانسیسی میں یہیں ہوا تھا ۔ یونیورسٹی آٹھ سو سال سے قائم ہے یہاں پر پروفیسروں کو اپنا طریقہ۔ تعلیم برتنے کی پوری آزادی تھی ۔

یونیورسٹی کے علاوہ فرانسس اول کے قائم کردہ شاہی کالج میں بھی یہ لکچر اٹنڈ کرتے تھے۔

دریائے سین کے کنارے جو علاقہ لاطینی محلہ کہلاتا تھا اسی محلے کے قریب سین ژاں ویو کی پہاڑی بھی ہے وہ اپنے زمانے کی ولی سمجھی جاتی ۔جون آف آرک کے ولی ہونے کا چرچا بھی اسی طرح رہا۔وہاں بہت سے اسکول اور کالج تھے طالب علموں اور آرٹسٹوں کا جمگھٹا رہتا ۔یہاں پرانی کتابیں بھی سستی مل جاتی تھیں ۔فرانسیسی کے علاوہ دوسری زبانوں کی کتابیں بھی ملتی تھیں ۔ہر گلی میں کوئی نہ کوئی نامی گرامی مصور رہتا ۔یہاں کے کافی ہاؤس مشہور تھے ۔اکثر تحریکیں ان ہی قہوہ خانوں سے نکلیں ۔فرانسیسی بڑے جوش سے بحث و مباحثہ کرتے لیکن تلخی کے بغیر۔فرانسیسی ادب میں اس کا بار بار ذکر آیا ہے۔

دریائے سین کے دائیں جانب دولت مندوں کے محلے تھے ۔غرض بڑی تفصیل سے انہوں نے پیرس کی ایک ایک چیز کا حال بیان کیا ہے ۔محلے ، دوکانیں ، ریسٹوراں ، چمن ، لور کا عجائب خانہ ، روشن راتیں مصروف دن ، عیش و طرب کے سامان اور مٹرگشت کرنے والے شوقین ۔ان سب کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور پیرس والوں کے ذوق اور سلیقے کو سراہا ہے۔

> "فرانسیسی لوگوں کو اندرونی اور بیرونی نمائش و آرائش کا خاص سلیقہ اور ذوق ہے ۔یہی سبب ہے کہ پیرس دنیا کا سب سے زیادہ حسین شہر ہے ۔قدم قدم پر اس قوم کے ذوق جمال کی داد دینی پڑتی ہے (۱۹)"

دسمبر ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور جنوری ۱۹۳۰ء میں وطن لوٹ آئے ان کا راست تعلق دو پروفیسروں سے خاص رہا موسیو مابیس یون اور موسیو ژول

بلوک ۔ ایک اسلامیات کا ماہر اور دوسرا ہندو علوم کا ۔ انہوں نے دل کھول کر ان دونوں پروفیسروں کی تعریف کی ہے اور ان سے فیض اٹھانے کا اعتراف کیا ہے ۔ دوسرے پروفیسروں سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ان کے اخلاق، علمیت اور زندگی کے رویے کے بارے میں اچھی رائے دی ہے ۔ پروفیسر فوشے کے بارے میں بھی لکھا ہے جو ہندوستان میں ایک عرصہ تک رہے وہ قدیم تصاویر کی حفاظت کے فن میں ماہر تھے ۔ حیدر آباد کے محکمے آثار قدیمہ کے ناظم غلام یزدانی نے بھی اجنتا کی تصاویر کے تحفظ کے سلسلے میں انہیں حیدر آباد بلانے کی سفارش کی تھی اور کام لیا تھا ۔ اس باب میں یوسف صاحب نے پروفیسروں کے علاوہ خاص ریل گاڑیوں، بسوں اور باغوں سب کا ذکر کیا ہے ۔

وہ فرانسیسی تہذیب کے بھی بڑے مداح تھے ۔ فرانسیسیوں کے وطن سے باہر نہ جانے کی بڑی دلچسپ وجہ بتائی ہے ۔

> " ان کے یہاں خدا کی دی ہوئی ہر چیز افراط سے موجود ہے ۔ جتنا اچھا اور ذائقہ دار کھانا ایک اوسط درجہ کے فرانسیسی کو ملتا ہے دنیا میں کسی دوسری قوم کے متوسط طبقے کے افراد کو میسر نہیں آتا " (۲۰)

وہ فرانس کی معیشت اور معاشرت کا حال سناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں ان کی ضرورت کی ہر چیز موجود ہے، پہاڑ، جنگل، معدنیات، کاشت کاری، تجارت، خوش ذوقی مگر ملک بھی اوسط درجے کا ہے کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے ۔ لوگ اعتدال پسند ہیں ۔ ۔ ان میں انقلابی طاقت بھی ہے اور انفرادیت پسندی بھی چونکہ محصول زیادہ ہے اس لئے دولت مند اپنی دولت بڑھانا نہیں چاہتے ۔ آبادی زیادہ نہیں اس لئے غربت بھی کم ہے ۔

فرانس والوں کو اپنی تاریخ اور تہذیب دونوں پر فخر ہے ۔ یہ اپنے ماضی کو یاد

رکھتے ہیں اور حال کو خوش ذوقی سے بسر کرتے ہیں ۔ان کی سیاست میں اپنی ذاتی رائے اور انفرادیت پسندی کو دخل نہیں ۔بے شمار سیاسی پارٹیاں ہیں ۔ فرانسیسی اقتدار کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔اس لئے اکثر آمریت غالب آتی ہے ۔لیکن ساتھ ہی آئے دن حکومتیں بدلتی رہتی ہیں ان کی تہذیب میں روحانیت کا دخل کم ہے ارضیت زیادہ ہے ۔

" فرانسیسی قوم کی ذہنیت وہاں کے کاشت کار کی ذہنیت ہے ۔ ان کی تہذیب میں بھی اسی لئے ارضیت پائی جاتی ہے ۔اس میں بہت زیادہ اونچی روحانی باتوں سے احتراز کیا گیا ہے ۔ زمین سے محبت ، کھانے کا شوق ، جنسی آزادی یہ ہیں اوسط درجے کے فرانسیسی کے مقاصد حیات ، باغبانی کا شوق ، ماہی گیری کا شوق ، مرغیاں پالنے کا شوق ، پھولوں کا شوق ، یہ سب باتیں کاشتکاری ہی سے کسی نہ کسی حیثیت سے تعلق رکھتی ہیں ۔ فرانسیسیوں کو صنعتی ترقی کی فکر نہیں اور نہ بڑے پیمانے کی پیداوار کو وہ زیادہ اہمیت دیتے ہیں ۔ ان کی صنعتیں بھی تنظیم کے لحاظ سے درمیانی درجے کی ہیں ۔وہ اپنے معاشی نظام سے مطمئن ہیں اور اس میں کسی بنیادی تبدیلی کے خواہاں نہیں "

(۲۱)

چنانچہ ان کا ہیرو بھی دوسرے ملکوں کے ہیرو سے الگ روشن خیال آرٹسٹ ہوتا ہے خواہ فلسفہ کا پروفیسر ہو یا اکیڈمی کارکن یا ناول نگار ۔وہ سیاست میں بھی

علمیت کو ترجیح دیتے ہیں اور روشن خیالی کے مداح ہیں۔

نشاۃ ثانیہ کے بعد فرانس میں جو علمی اور تہذیبی ترقی ہوئی اور جن لوگوں نے نام کمایا ان میں مصور، نقاش اور عالم سب ہی ہیں۔ان کا ذکر بھی یوسف صاحب نے بہت پر لطف طریقے سے کیا ہے۔فرانسیسی ادب کے مطالعہ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بہت تفصیل سے ان سب نمایاں ادیبوں کا ذکر کیا ہے جنھیں انھوں نے شوق سے پڑھا اور اس عہد کے نامور ادیبوں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے وہ ملے۔ان کی تصانیف کا تجزیہ کرتے ہوئے بعض ایسی رائیں ظاہر کی ہیں جو ان کی کتاب فرانسیسی ادب اور ان کے تنقیدی تصانیف کے صفحات پر بار بار ہماری نظر سے گزرتی ہیں۔ جیسے پروست کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

"جدید ذہن کلاسکی اور رومانی ذہن سے علیحدہ ہیں۔
اس کے کرداروں کی رہنمائی عقل و منطق سے
نہیں بلکہ وجدان سے ہوتی ہے جو حسی تجربے کی
اصلیت کو جھٹلاتا نہیں بلکہ وہ جیسی ہے اسی طرح
اسے پیش کرتا ہے"(۲۲)

انھوں نے ادیبوں، فن کاروں، تصویروں اور کتابوں کے بارے میں تو لکھا ہی ہے ان تحریکوں کا بھی بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے جو وقتاً فوقتاً فرانس میں رونما ہوتی رہیں اور وہیں سے یہ تحریکیں ساری دنیا کو متاثر کرتی رہیں۔چنانچہ ہمارا اپنا مشاہدہ ہے کہ آج دولت مند امریکن اس وقت تک اپنے آپ کو مہذب نہیں سمجھتا جب تک کہ وہ فرانس میں کچھ عرصہ نہ گزار دے۔

اپنے زمانہ قیام میں فرانسیسیوں کے علاوہ مشرقی ممالک سے آنے والے طالب علموں اور مشاہیر سے بھی ان کی ملاقاتیں ہوئیں۔چند ہندوستانیوں سے روابط بڑھے جو بہ حیثیت طالب علم تھے یا مستقل طور پر وہیں رہتے تھے یا تفریحاً آیا جایا کرتے

تھے ۔ مہاراجا بڑودہ سے بھی یوسف صاحب کی ملاقات ہوئی ۔ وہ فرانسیسی بہت اچھی طرح بولتے تھے ۔ انہوں نے بڑودہ بہ حیثیت پروفیسر آنے کی دعوت بھی دی ۔ وہ بڑے روشن خیال بیدار مغز انسانیت دوست اور علم پرور شخص تھے ۔ اگر یوسف صاحب کو عثمانیہ یونیورسٹی میں کام نہ ملتا تو وہ کہتے ہیں کہ شاید میں بڑودہ چلا جاتا ۔ بعض ملاقاتیوں کا سرسری ذکر کیا ہے اور بعض کا تفصیل سے

ایک اطالوی خاندان سے دوستی کی وجہ سے انھوں نے ۱۹۲۷ء میں اٹلی کا سفر بھی کیا تھا اور تاریخ کے طالب علم کے لئے تو ہر راستہ روم کو جاتا ہے ، فلورنس ، روم نیپلز ، جنیوا اور وینس کا تفصیلی ذکر کیا ہے ۔ اطالوی کردار ، زبان ، کشتی رانی ، تاریخی یادگاریں سب پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے ۔

واپسی میں وہ سوئیزر لینڈ کے راستے پیرس واپس ہوئے اس طرح انھوں نے اس کوہستانی جنت کو بھی دیکھ لیا ۔ فرانس کے سارے شہر بھی دیکھے اور ساحلی علاقوں کی سیر بھی کرتے رہے ۔ یوسف صاحب پیرس کے بڑے مداح ہیں اسے عالم میں انتخاب شہر سمجھتے ہیں ۔ ان کے الفاظ میں ۔

> " پیرس جس طرح حسن اور دولت کو اپنی طرف
> کھینچتا ہے اسی طرح علم و حکمت کو بھی کھینچتا ہے ۔
> یہ کوئی بری بات نہیں ۔ قومی زندگی کا دھارا اس
> طرح اپنی پوری قوت اور توانائی سے بہتا رہتا ہے "
>
> (۲۳)

وہ ساحلی علاقوں کی سیر کرتے کرتے اسپین کو بھی چھو آئے ویسے اٹلی اور اسپین کے بہت سے لوگوں نے فرانس کو اپنا وطن ہی بنالیا تھا ۔

پیرس کا تو انھوں نے سارے باب ہی میں بہت ذکر کیا ہے اس کے باوجود مستقل عنوانات کے تحت بھی وہاں کا حال لکھا ہے ۔ پیرس کے قیام کے دوران

ہندوستان کے جن بڑے لوگوں سے ملنا ہوا ان کے نام تفصیل سے گنوائے ہیں اور بعض پر نوٹ لکھے جیسے ۔

"پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، سری نواس آئنگر ، مولانا محمد علی ، محمد شعیب قریشی ، عبدالرحمن صدیقی ، پروفیسر ہمایوں کبیر ، قاضی عبدالودود ، سجاد ظہیر اور ملک راج آنند کے نام مجھے اس وقت یاد آتے ہیں ۔" (۲۴)

مولانا محمد علی سے ملاقاتوں کا بہت لطف اٹھایا وہ ان کے بڑے مداح و معترف تھے ۔اس لئے ان کے بارے میں جو تاثرات لکھے ہیں وہ خود ایک مستقل مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں ۔اس تفصیل سے لکھا ہے کہ رشید احمد صدیقی کا گنجہائے گرامایہ والا خاکہ جو مرصع مرقع ہے تشنہ معلوم ہوتا ہے ۔ مولانا محمد علی کی شخصیت نے یوسف صاحب کے قلم کو بھی ایک عجیب رعنائی بخشی ہے جس میں محمد علی کی سیرت کا جلال و جمال دونوں موجود ہیں ۔

"مولانا محمد علی کی شخصیت میں ایک طرف تو ان کا سوز و گداز اور ان کی والہانہ سپردگی اور ربودگی جاذب نظر تھی اور دوسری طرف ان کی لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی جس میں الوالعزمی اور مردانہ عزم و اعتماد صاف جھلکتا تھا ۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ان کی روحانیت ان کی گفتگو کے لہجے اور تحریر کے طرز میں چھپائے نہیں چھپتی جس سے ان کی انفرادیت کا اظہار ہوتا تھا ۔ اسی کو غالب نے "شیوہ گفتار" کہا ہے ، جس میں سوز و گداز بھی ہے ،

طنطنہ اور طنز بھی، بے خوف مردانگی تھی"(۲۵)

مولانا محمد علی کی خاطر یہ لندن بھی گئے اور لندن کا حال بھی لکھا۔ فرانس کی جن عمارتوں کو دیکھا ان کی تفصیل بیان کی۔ فرانس کو پھولوں کا شہر کہتے ہیں۔ پھولوں سے ان کو ذاتی رغبت رہی ہے۔ خوشبو کے لیے ان کی حس شامہ بڑی تیز رہی ہے۔

وہاں کی آزاد خیالی، حسن کی نیرنگیاں اور جنسی بے لگامی کا ذکر کرتے ہوئے اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اکثر مشرقی نوجوان ان سب باتوں سے ناآشنا ہوتے ہیں اور اچانک چھوٹ ملتی ہے تو بے راہ رو ہو جاتے ہیں۔ دبے لفظوں میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ یہ کڑا وقت ان پر بھی پڑا۔ وہ مغربی تہذیب کی خوبیاں بھی بیان کرتے ہیں اور خامیاں بھی۔

اس کتاب کا ساتواں باب "دیار تلنگ" کے عنوان سے ہے۔ اس سے پہلے کے باب کو دیار فرنگ کہا ہے ممکن ہے کہ غیر شعوری طور پر قافیہ پیمائی منظور ہے۔ سلطنت حیدر آباد مرحوم میں بڑا حصہ تلنگانہ کا ہے لیکن اس میں مرہٹواڑہ اور کرناٹک کا علاقہ بھی شامل تھا۔ اس لیے ریاست کو دیار تلنگ کہنا مناسب نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ شہر حیدر آباد علاقہ تلنگانہ میں تھا اسی رعایت سے شاید جواز نکل آیا ہو۔

یوسف صاحب ۱۹۳۰ء میں ہندوستان واپس آئے اور دہلی میں ذاکر میاں کے پاس کچھ دن ٹھہر کر راس مسعود سے ملنے علی گڈھ پہنچے کیونکہ انہوں نے علی گڈھ آنے کو بطور خاص کہا تھا۔ علی گڈھ سے واپس آکر دہلی میں چند ہفتے ٹھہرے اور پھر حیدر آباد آگئے۔ حیدر آباد کو انہوں نے دیار تلنگ کہا ہے۔ یہاں اپنے عزیز اور والد کے دوست اکبر یار جنگ کے یہاں ٹھیرے۔ مولوی عبدالحق ان دنوں حیدر آباد میں تھے۔ انجمن ترقی اردو کا دفتر اورنگ آباد میں تھا چھٹیوں میں وہاں چلے جاتے تھے۔ اس زمانے میں اردو انگریزی ڈکشنری مرتب ہو رہی تھی مولوی صاحب نے انہیں بھی کام

میں شریک کر لیا اور کچھ دنوں حیدر آباد میں رہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے بارے میں انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے اور مولوی صاحب کو اپنا محسن کہا ہے اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے حال پر ہمیشہ نظر عنایت رہی اور ان کی محبت میں بہت کچھ سیکھا کچھ عرصہ تک ان کے ساتھ ان ہی کے مکان میں مقیم رہے بعد میں علحدہ رہنے لگے۔ مولوی صاحب ایلورہ اجنتا کے بڑے مداح تھے ان ہی کے کہنے سے یوسف صاحب نے وہاں کے غاروں کو دیکھا اور نہیں بعد میں بھی کئی بار دیکھنے کا موقع ملا۔ غلام یزدانی ناظم آثار قدیمہ کی باریک بیں نظر سے استفادہ بھی کیا اور اور اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے اجنتا کی تصویروں کا تجزیہ کیا ہے اور اس کے پیچھے کارفرما مصوروں کے جذبات کا بھی۔ بدھ راہبوں کے جذبات پر بھی نظر ڈالی ہے اور اس زمانے کی تہذیب اور معاشرت پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

۱۹۳۰ء میں یوسف صاحب کی شادی ان کی بڑی بھاوج کی بہن یعنی جان عالم خاں کی دختر راحت بیگم سے ہوئی۔ حیدر آباد میں بنجارہ ہلز پر گھر بنایا اور پھر اس طرح بسے کہ یہی ان کا وطن ثانی بن گیا۔ اپنا ذاتی گھر بنانے سے پہلے انہوں نے مانصاب تالاب کے کنارے پر کرایہ کا مکان لیا تھا۔ یہ سڑک گولکنڈہ کو جاتی تھی کئی بار وہ گولکنڈہ بھی گئے۔ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کے اندر کا مؤرخ بولنے لگتا ہے۔

> "گولکنڈہ کے کھنڈر دیکھنے گیا۔ بڑے شاندار کھنڈر ہیں۔ عجیب بات ہے کہ یہاں ویرانی نہیں ہے۔ میں دوسروں کی نسبت نہیں کہہ سکتا لیکن میرا ذاتی تجربہ ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کھنڈروں کے در و دیوار مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس کے اشاروں کو سمجھا اور ان سے عبرت حاصل کی۔"

یہی نہیں وہ قطب شاہی سے لیکر آصف جاہی دور تک ایک طائرانہ نظر ڈال لیتے ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں جب وہ پروفیسر تھے اس زمانے میں یہاں ذریعے تعلیم اردو تھا۔ اسلیے عام آدمی کے لیے اعلیٰ تعلیم کا حصول سہل ہو گیا۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا کہ ہندوستانی زبان میں اعلیٰ تعلیم کا پہلا کامیاب تجربہ یہیں کیا گیا۔ یوسف صاحب جس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ میں داخل ہوئے تو اس برادری میں ایک سے ایک قابل فرد موجود تھا۔ حیدرآباد کے علاوہ ہندوستان بھر سے اپنے فن کے ماہر یہاں چن کر جمع کیے گئے تھے۔ ان ہی میں فلسفہ کے پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم بھی تھے جو ان کے منجھلے بھائی عابد حسین خاں کے ایم۔اے۔او کالج میں ہم جماعت رہ چکے تھے۔ ان کی ذہانت، شگفتہ مزاجی اور باغ و بہار شخصیت نے ہر ایک کا دل موہ لیا تھا۔ وہ خشک مزاج فلسفی نہیں تھے۔ یوسف صاحب سے ان کے خاص مراسم قائم رہے خاص طور پر اسٹاف کلب میں ان ہی کی وجہ سے دل لگا رہتا۔

حیدرآباد کے دوران قیام یوسف صاحب کو کئی بڑے ادیبوں اور شاعروں سے ملنے کا موقع ملا۔ جوش، جگر، فانی اور قاضی عبدالغفار سب ہی سے ملاقاتیں ہوئیں جوش کا پھکڑ پن ایسا تھا کہ یوسف صاحب کی احتیاط پسند طبیعت نے زیادہ قریب ہونے کی کوشش نہیں کی البتہ جگر صاحب کو وہ پسند کرتے تھے اور ان کے تعلق سے اصغر گونڈوی صاحب کے بھی وہ مداح رہے۔ ان سے اور پنڈت کیفی سے حیدرآباد ہی میں ملاقات رہی۔ فانی تو حیدرآباد ہی میں رہتے تھے ان سے نہ صرف ملاقاتیں رہیں بلکہ یوسف صاحب نے انہیں یونیورسٹی میں لانے کی کوشش بھی کی تھی۔ قاضی عبدالغفار مدیر پیام سے ذاتی تعلقات قائم رہے اور پندرہ سولہ سال جب تک وہ حیدرآباد میں رہے ملاقاتیں جاری رہیں۔ آغا حیدر حسین، سرجنی نائیڈو، شہزادی درشہوار (جن کے صاحبزادے مکرم جاہ بہادر کے اتالیق بھی رہے تھے) سر اکبر حیدری

اور لیڈی حیدری، مہدی نواز جنگ پر بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ حیدرآباد کے زمانے قیام میں انہیں بعض بڑے بڑے دانشوروں سے ملنے کا موقع بھی ملا ان ہی میں مترجم قرآن مارماڈیوک پکتھال جو انسانی مساوات اور عالمی اخوت کے قائل تھے، چادر گھاٹ کالج کے پرنسپل اور اسلامی کلچر کے پہلے ایڈیٹر بھی تھے۔

ان ہی دانشوروں میں نیک اخلاق پکے مسلمان جنوبی ہند میں تعلیم کو فروغ دینے والے ڈاکٹر محمد عبدالحق بھی تھے جو بعد میں علی گڈھ یونیورسٹی کے پرو وائیس چانسلر اور پھر مدراس سروس کمیشن کے ممبر بنے۔ شبلی کے شاگرد رشید سلیمان ندوی سے بھی یہیں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے شبلی کی ناتمام سیرت النبیؐ کی تکمیل کی۔ نقوش سلیمانی اور خیام ان کی اپنی تصانیف ہیں۔ ان کی تحقیق اونچے معیار کی اور تحریر پروقار سمجھی جاتی ہے۔ اپنے وقت کے جید مصنف اور بے باک صحافی مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے اگرچہ جامعہ میں نیاز حاصل ہو چکا تھا مگر زیادہ ملاقاتیں حیدرآباد میں ناظر یار جنگ کے گھر پر ہوتی رہیں۔ اسی طرح خواجہ غلام السدین، مشیر تعلیم اور پرستار اقبال جب بھی حیدرآباد آتے یوسف صاحب ہی کے یہاں قیام کرتے۔

حیدرآباد کی انجمن ترقی اردو اور حبیب الرحمن صاحب، جو ذاکر صاحب کے ہم جماعت بھی تھے کی خدمات پر بھی انہوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے جن کی وجہ سے اردو کالج اور اردو آرٹس کالج قائم ہوئے۔ ان کی عطیہ دی ہوئی زمین پر ہی اردو ہال بنا اور انجمن ترقی اردو حیدرآباد کو بے حد کارکرد بنا دیا۔

اسی طرح اشخاص کے علاوہ شہر حیدرآباد پر انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ محلات، گنج، بازار میں ملنے والے ساز و سامان عام ہندو مسلمانوں کی زندگی پیشے لباس سب ہی کو بیان کیا ہے۔ ان اشخاص اور واقعات کے ذکر کی وجہ سے اس زمانے کی حیدرآباد کی سیاسی، سماجی زندگی، تقاریب، مختلف میدانوں میں کارنامے، سواریاں، تفریح گاہیں، علم پروری، اخلاق، شائستگی، دعوتوں کے اہتمام، آپس میں خلوص و برتاؤ

سب کا تذکرہ ہوا ہے۔ جس سے عثمانی دور کے حیدر آباد کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے کوئی اس دور پر کام کرنا چاہے تو یہ باب حوالے کا کام دے سکتا ہے۔

حیدر آباد ایک دیسی ریاست تھی اور اکثر دیسی ریاستوں کے مقابل اپنے نظم و نسق اور امن و آمان کے باعث نمایاں مقام رکھتی تھی۔ جونہی تحریک آزادی کی گرمی آئی اور انگریزوں کے چل چلاؤ کا وقت آیا اور وہ چلے بھی گئے تو یہاں کے حالات میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ انگریز انہیں معلق چھوڑ گئے۔ ریاست کو بچانے کے لیے جن لوگوں نے کوشش کی تھی اور جو وفد انگلستان گیا تھا اس میں بہ حیثیت ترجمان یوسف صاحب بھی شریک تھے مگر وفد ابھی پیرس ہی پہنچ سکا تھا کہ حیدر آباد میں پولیس ایکشن ہوا اور حکومت آصف جاہی کا خاتمہ ہو گیا حیدر آباد پر دنیا کی تباہی آئی۔ چنانچہ اس تباہی پر غم و افسوس محسوس کرنا فطری ہے۔

"مجھے حیدر آباد کی تباہی اور آصف جاہی خاندان کی حکمرانی ختم ہونے کا سخت افسوس تھا۔ نہ صرف یہ کہ میں حیدر آباد میں پیدا ہوا تھا بلکہ جذباتی طور پر میں نے اپنے آپ کو حیدر آباد سے وابستہ کر لیا تھا۔ ہمارے خاندان کا تین پشتوں سے دکن سے تعلق رہا تھا۔ دادا، چچا، والد اور میں خود وہاں رہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میر محبوب علی خان کے انتقال کی خبر ہم لوگوں کو قائم گنج میں معلوم ہوئی تھی تو ہماری والدہ کے آنسو نکل آئے تھے۔" (۲۷)

ویسے انھوں نے ان اسباب اور حالات کا بھی تجزیہ کیا ہے جس کی وجہ سے یہ تباہی بہت زیادہ اندوہناک ثابت ہوئی۔

یوسف صاحب نے ۱۹۵۶ء میں اسٹریلیا کا سفر کیا اور ہندوستانی تہذیب پر لکچر

دیئے ۔ سفر کا حال بیان کرتے ہوئے بہت سی باتوں پر روشنی ڈالی ہے سنگاپور اور انڈونیشیا کا بھی ذکر کیا ہے ۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے بارے میں بڑی فراخ دلی سے کہا ہے ۔

"میں نے عثمانیہ یونیورسٹی کی علم نواز اور علم پرور فضا میں دوسروں کو جتنا سکھایا اس سے زیادہ خود سیکھا ۔" (۲۸)

انھیں یہاں فراغت میسر رہی ، مطالعہ کی سہولت نے ان کے اندر کے مورخ اور ادیب کو بیدار کیا ۔ وہ سب سے ملنے ملانے کے باوجود زیادہ تر عزلت پسند رہے جس کی وجہ سے لکھنے لکھانے کا کام کافی ہوا ۔ اور وہ اس کتاب کے لکھتے وقت یہ کہہ سکے

"مجھے یہ اطمینان ہے کہ میں نے اپنی حد تک اردو زبان کی تھوڑی بہت خدمت کی ۔ بحمد اللہ اردو کی خدمت کا جذبہ آج بھی میرے دل میں موجود ہے ۔ اب جو کچھ دماغی اور جسمانی قوت باقی ہے ۔ وہ انشاء اللہ زبان اردو کی خدمت ہی میں صرف ہوگی" (۲۹)

اس باب کے آخری پارے میں حیدرآباد کی روایات اور تہذیب کے مٹائے جانے پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ صدیوں میں جاکر اس ملی جلی تہذیب کی آبیاری ہوئی تھی ۔ ایک طرف یکجہتی کا راگ الاپا جاتا ہے دوسری طرف ایسی عمدہ روایات کو مٹایا جاتا ہے ۔ آخر میں انھوں نے اپنی نجی زندگی کا مختصر حال بیان کیا ہے

اس پوری کتاب میں عام طور پر اور اس باب میں خصوصیت کے ساتھ جن ذیلی شخصیتوں یا واقعات اور حالات کا ذکر کرتے ہیں تو بے ساختہ ہمیں روشنی اور آواز کی اس تکنیک کا خیال آتا ہے جس میں پرانے کھنڈروں میں داستاں کو از سر نو تازہ

کیا جاتا ہے۔ دہلی کے لال قلعے میں تو یہ ہوتا ہی ہے حیدر آباد کے گولکنڈہ میں بھی اسے آزمایا گیا ہے یعنی غنائیہ۔ یا منظوم ڈرامہ، راوی کے ذریعے کہانی شروع ہوتی ہے تو کھنڈروں اور پرانی عمارتوں کے مخصوص حصوں پر روشنی پڑتی ہے اور وہ جگمگاتے حصے ان آوازوں کے پس منظر کے ساتھ اپنی اپنی داستان سنانے لگتے ہیں۔ پھر روشنی کا رخ کسی اور گوشے کی طرف ہوجاتا ہے اسی طرح یوسف صاحب کی تحریر اپنے یادوں کے ذخیرے کو ٹٹولتی ہے تو ایک ایک کر کے اشخاص، حالات، واقعات، عمارات، کوچہ و بازار جاگ اٹھتے ہیں اور اس فضا میں داخل کر دیتے ہیں، زمانے کا فصل ختم ہوجاتا ہے اور یہ گم شدہ علامتیں زندہ ہوجاتی ہیں۔

کتاب کا اٹھواں باب " علی گڑھ " کے عنوان سے ہے۔ یوسف صاحب نے حیدر آباد کی سب سے دلکش بستی بنجارہ ہلز کے ایک وسیع قطعہ زمین پر بہت کشادہ اور بڑا مکان بنوایا تھا اور شائد یہ ارادہ ہو کہ عثمانیہ یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد باقی ماندہ زندگی یہیں گزاریں مگر جب وظیفہ لے کر گھر بیٹھ رہے تو معلوم ہوا کہ توانائی کا سر چشمہ ابھی خشک نہیں ہوا۔ ویسے بھی ان دنوں حکومت حیدر آباد کے قانون کے لحاظ سے ۵۵ سال کی عمر میں آدمی کو وظیفہ دے دیا جاتا۔ بعد میں عمر کی حد بڑھا کر ۵۸ سال پھر ۶۰ سال کر دی گئی۔ گھر بیٹھنے کے بعد وہ تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں شناسائی اور ملاقات کی حد تک وہ بہت سے لوگوں کو جانتے تھے مگر گہری دوستی کسی سے نہ تھی۔ اس لئے ان کے لئے حیدر آباد، دہلی اور علی گڑھ ہر جگہ مساوی تھی۔ ایسے لوگ راہ زندگی کے تنہا مسافر ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں چشمہ اور نخلستان مل گیا وہیں پڑاؤ ڈال دیا اور جوں ہی حالات بدلیں پھر چل پڑے۔ ایسے لوگ کسی جگہ کے پابند نہیں ہوتے۔ ان کے لئے ہر ٹھکانا عارضی ہی ہوتا ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی سے ۱۹۵۷ء میں سبکدوش ہوئے۔ سات آٹھ مہینے جو گھر میں

فرصت کے ملے تو اپنی کتاب "فرانسیسی ادب" لکھ ڈالی۔ ۱۹۵۸ میں انڈین نیشنل آرکائیوز کی ڈائرکٹری کے لئے پبلک سروس کمیشن نے درخواستیں طلب کیں تو انھوں نے بھی درخواست بھیج دی اور وہ منتخب ہوگئے۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہونے کے علاوہ ریاست کے ریکارڈ آفس میں کیوریٹر اور مشیر کی حیثیت سے یہ کام کر چکے تھے اور مغلیہ عہد میں سلاطین دکن کے مراسلات اور فرامین کے بارے میں یہ تحقیقی کام کر کے چھ جلدیں بھی شائع کر چکے تھے۔ اسی لئے کام یوسف صاحب کی لیاقت اور تجربہ کے لئے بہت موزوں تھا۔ لیکن عین وقت پر انھوں نے راستہ بدل دیا کیونکہ اسی دوران کرنل بشیر حسین زیدی نے علی گڈھ یونیورسٹی کے پروائس چانسلر کے عہدے کے لئے ان کی نامزدگی کے بارے میں استصواب رائے کیا تھا۔ یونیورسٹی کا عہدہ ان کی علمیت، تصنیف و تالیف کے شوق اور درس و تدریس کے تجربے کی وجہ سے انھیں زیادہ دلکش لگا اسی لئے حامی بھر لی۔

پروفیسر ہونا اور چیز ہے پرو وائس چانسلر اور چیز ہے۔ پروفیسری اعلیٰ تعلیمی مشغلہ ہے۔ لیکن پرو وائس چانسلری اعلیٰ تعلیم کے انتظامی امور سے عہدہ برآ ہونے کا کام ہے۔ پرو وائس چانسلری کے عہدے میں اس بات کی خاص ضرورت تھی کہ پرو وائس چانسلر اور وائس چانسلر میں مزاج کے لحاظ سے ہم آہنگی ہو۔ جب تک زیدی صاحب اس کے سربراہ رہے تعاون بھی کامل رہا۔ لیکن بعد میں جب حالات بدلے اور شورشیں ہوئیں تو سارا سکون درہم برہم ہوگیا۔

یوسف صاحب علی گڈھ یونیورسٹی کے اولڈ بوائے تو نہ تھے البتہ ان کے تین بڑے بھائی ایم۔ اے۔ او کالج کے نمایاں طالب علم رہ چکے تھے۔ یہ اور ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمود حسین خان علی گڑھ کے گورنمنٹ ہائی اسکول کے طالب علم رہ چکے تھے۔ ہر چھٹی میں ذاکر میاں کے پاس پکی بارک میں رہنے چلے جاتے۔ جب وہ پکی بارک میں رہنے لگے تو وہاں بھی جانے لگے۔ اسی دوران ذاکر میاں کے ساتھیوں

مولانا اقبال سہیل اور رشید احمد صدیقی سے تعلقات قائم ہوگئے اور یہ تعلقات آخر عمر تک برقرار رہے ۔ علی گڈھ ان کے لئے اجنبی نہ تھا ۔ ایم ۔ اے ۔ او کالج سے علی گڈھ یونیورسٹی تک ہر مرحلے کی کشمکش اور سرسید اور ان کے رفقاء کے مقاصد ان کے سامنے واضح اور روشن تھے ۔ شاید اسی لئے بے جھجک انھوں نے یہ عہدہ قبول کرلیا ۔ حالانکہ ابتداء سے لیکر اب تک ایک لمبا عرصہ گزر چکا تھا ۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے پرسکون ماحول میں رہ کر انھیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ گنگا جمنا میں بہت سا پانی بہہ گیا ہے اور شمالی ہند کی اکثر یونیورسٹیوں میں سیاست اور گروہ بندی در آئی ہے ۔

اس باب میں علی گڑھ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے سرسید احمد خان کے مقصد کو واضح کیا ہے ۔ جب وہ ام ۔ اے ۔ او کالج قائم کر رہے تھے اس وقت ہی سے ان کے سامنے یونیورسٹی کا خاکہ تھا ۔ وہ مسلمانوں میں مغربی علوم و فنون کو رائج کرنا چاہ رہے تھے ۔ یہاں ہر مذہب و ملت کے طلباء کی نمائندگی رہی ۔ ۱۹۲۰ ۔ اور ۱۹۵۰ کے ایکٹ میں بھی سرسید کے ان مقاصد کو تسلیم کیا گیا اور کہ مسلم یونیورسٹی مغربی علوم و فنون کی تعلیم و اشاعت کے ساتھ اسلامی تہذیب و کردار کا سرچشمہ ہوگئی ۔ یوسف صاحب نے پہلے وائس چانسلر کے ان الفاظ کو دہرایا ۔

> " ہماری خواہش یہ ہے کہ وہ ایک ایسا علمی اور اخلاقی مرکز ہو جہاں بلند اور پاکیزہ خیالات مجتمع ہوں ، جہاں سے روشنی اور تہذیب کی شعاعیں تمام ہندوستان بلکہ تمام دنیا پر پڑیں اور جو تمام عالم کے واسطے ہمارے دین کی سچائی اور پاکیزگی کا عمدہ معیار ہو " (۳۰)

اقلیتی ادارہ ہونے کے باوجود یہاں سب مذاہب کے لئے دروازے کھلے تھے اور رواداری کا برتاؤ بھی تھا ۔ ۱۹۴۷ ۔ کے فسادات کے زمانے میں بھی یونیورسٹی بند

نہیں ہوئی ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور پھر کرنل بشیر حسین زیدی نے اپنے وسیع علمی و انتظامی تجربہ سے یونیورسٹی کو بہت فائدہ پہنچایا ۔ لیکن جب ۱۹۵۱ء میں یوسف صاحب نے وہاں کام شروع کیا تو وزارت تعلیم اور پارلیمنٹ میں اسے ناروا تنقیدوں کا ھدف بنایا جانے لگا ۔ تحقیقاتی کمیٹی قائم ہوئی اور ۱۹۶۱ء میں رپورٹ کونسل اور پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہوئی ۔ کمیٹی نے اس کے کردار کو برقرار رکھنے کی سفارش کی اور کہا کہ حکومت کو مالی امداد دینے کے لئے کوئی ایسی شرط لگانا نہیں چاہیئے جو اس کے اقلیتی کردار کے منافی ہو ۔ البتہ حسابات میں چھوٹی موٹی غلطیوں کی نشاندہی کی ۔ بڑے اداروں کے لاکھوں کروڑوں کے حسابات میں یہ غلطیاں نظرانداز کی جاتی ہیں لیکن وہ عناصر جو اس یونیورسٹی کو خصوصی کردار کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتے تھے انھوں نے یونیورسٹی کو بدنام کرنے کی پوری کوشش کی ۔ فرقہ وارانہ اخبارات نے مسلسل اس کے خلاف لکھا اور وقار کو متاثر کیا ۔ ہر یونیورسٹی کی طرح اس یونیورسٹی میں بھی الیکشن کے موقع پر پارٹی بندی ہوئی اور پھر تھوڑی سی مارپیٹ بھی ۔ اخبارات نے اس بات کو بڑھا چڑھا کر لکھا ۔ مشہور کیا کہ کچھ لڑکے مارے گئے ہیں ۔ اس طرح مخالف یونیورسٹی مجمع کو بھڑکایا ۔ کچھ لوگوں نے وائس چانسلر علی یاور جنگ اور یوسف صاحب میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ جس یونیورسٹی کے طالب علموں کے اخلاق اور رویہ کی تعریف کی جاتی تھی اس کو اس منزل پر پہنچا دیا کہ ساری نیک نامی اور روایات پر پانی پھر گیا ۔ جب حالات ابتر ہوئے اور وائس چانسلر طالب علموں کے نرغے میں گھر گئے تو یوسف صاحب وائس چانسلر کو بچانے کی خاطر خود زخمی ہو گئے ۔ پولیس کی گولیوں سے دو لڑکے مارے گئے ۔ یونیورسٹی کا ایکٹ معطل ہوا اور پھر انہوں نے اس خیال سے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا کہ نئے وائس چانسلر اپنی مرضی سے کسی شخص کو پرووائس چانسلر بنا سکیں ۔

یوسف صاحب علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں بھی پڑھنے لکھنے سے بالکل

غافل نہیں رہے تھے ۔ فکر و نظر کی ادارت کا کام سنبھالا اور مضامین لکھے جو بعد میں "کاروان فکر" کے نام سے شائع ہوئے ۔ وہاں جن اساتذہ سے تعاون ملا ان کے شکر گزار رہے خاص طور پر رشید صاحب کے ، جن کی بڑے بھائی جیسی سرپرستی ہمیشہ حاصل رہی ۔ یونیورسٹی کے زمانے میں سب سے پسندیدہ کام مولانا آزاد لائبریری کی تنظیم تھی جو انھوں نے دوسرے تنظیمی امور کے ساتھ اپنی شخصی دلچسپی کی وجہ سے انجام دی ۔ باقاعدہ لائبریرین کا تقرر ہونے تک یوسف صاحب لائبریرین کی ساری ذمہ داریاں سنبھالتے رہے ۔ دفاتر میں جو قدیم کاغذات تھے انہیں جمع کیا ۔ ان کاغذات میں سرسید کی سائینٹفک سوسائٹی اور ام ۔ اے ۔ او کالج کی دستاویزی حیثیت رکھنے والے خطوط میں سے انتخاب کر کے ایک جلد تیار کر دی ۔ یہ جلد ایشیا پبلیشنگ ہاؤس بمبئی نے Selected Documents of Aligarh Archieves کے نام سے شائع کی ۔ علی گڑھ کو مولانا حبیب الرحمن شروانی کے خاندانی کتب خانے سے جو حبیب گنج کہلاتا تھا بہت بڑا ذخیرہ ملا ۔ اس ذخیرے کو ملا کر بارہ ہزار کے لگ بھگ قلمی کتابیں علی گڑھ میں موجود ہیں ۔ یہ ہندوستان میں سب سے بڑا ذخیرہ ہے ۔ فہرست سازی کے لئے یو ۔ جی ۔ سی سے گرانٹ حاصل کی ۔ طالب علموں سے بھی ان کے تعلقات کافی اچھے رہے اور بعد میں بھی وہ سب محبت سے ملا کرتے تھے ۔

علی گڈھ میں جن شخصیتوں سے تعلقات بڑھے ان میں سیدنا طاہر سیف الدین ، مولانا سید ابوالحسن ندوی ، صدیق حسن آئی ۔ سی ۔ یس اور عبدالمجید خواجہ قابل ذکر ہیں

غرض سات سال بہ حیثیت پرو وائس چانسلر کام کرنے کے بعد ۱۹۶۵ ۔ میں استعفیٰ دے دیا اور دہلی میں نظام الدین میں کرائے کے مکان میں رہنے لگے اور پھر تصنیف و تالیف میں اس طرح جٹ گئے کہ جیسے اس کا سلسلہ کبھی ٹوٹا ہی نہیں تھا ۔ آخر دم تک ان کے لکھنے لکھانے کا مشغلہ جاری رہا اور علمی اداروں اور کاموں کے

مددگار رہے۔

جب وہ یادوں کی دنیا لکھ رہے تھے تو ماضی کی ان یادوں کی خوشبو ان کے دل و دماغ کو مہکاتی رہی، تصور کے جادو جگاتی رہی اور انھوں نے جانا کہ یہی یادیں ان کی پہچان ہیں اور ان ہی سے خود شناسی میں مدد ملی۔

ہم بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک بہترین کتاب ہے۔

حوالے

(۱) سید صباح الدین عبدالرحمن ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان مرحوم، ہماری زبان ۔ ۱۵ / جنوری ۱۹۸۰ء

(۲) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، دیباچہ

(۳) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۴۹)

(۴) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۴۸۔۴۹)

(۵) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۵۹۔۶۰)

(۶) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۶۶۔۶۷)

(۷) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۱۱۱)

(۸) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۱۱۰۔۱۱۱)

(۹) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۱۱۹)

(۱۰) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۱۳۵)

(۱۱) ضیاء الحسن فاروقی، شہید جستجو، صفحہ (۵۹۳)

(۱۲) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۱۵۴)

(۱۳) رشید احمد صدیقی ۔ گنجہائے گرانمایہ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری

(۱۴) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۱۶۵)

(۱۵) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۱۶۷)

(۱۶) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۱۶۹۔۱۷۰)

(۱۷) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۱۸۵)

(۱۸) ڈاکٹر یوسف حسین خان یادوں کی دنیا، صفحہ (۱۹۹)

(۱۹) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۲۱۸)

(۲۰) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۲۲۵)

(۲۱) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔ یادوں کی دنیا، صفحہ (۲۳۲)

(۲۲) ڈاکٹر یوسف حسین خان - یادوں کی دنیا، صفحہ (۲۳۶)
(۲۳) ڈاکٹر یوسف حسین خان - یادوں کی دنیا، صفحہ (۳۵۷)
(۲۴) ڈاکٹر یوسف حسین خان - یادوں کی دنیا، صفحہ (۲۶۵)
(۲۵) ڈاکٹر یوسف حسین خان - یادوں کی دنیا، صفحہ (۲۹۱)
(۲۵) ڈاکٹر یوسف حسین خان - یادوں کی دنیا، صفحہ (۳۴۱)
(۲۷) ڈاکٹر یوسف حسین خان - یادوں کی دنیا، صفحہ (۳۰۴)
(۲۸) ڈاکٹر یوسف حسین خان - یادوں کی دنیا، صفحہ (۴۳۵)
(۲۹) ڈاکٹر یوسف حسین خان - یادوں کی دنیا، صفحہ (۴۳۶-۴۳۵)
(۳۵) ڈاکٹر یوسف حسین خان - یادوں کی دنیا، صفحہ (۴۴۳-۴۴۲)

غالب اور آہنگ غالب

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی شخصیت غالبیات کے سلسلے میں مشہور ہے ۔ وہ خود کہتے ہیں کہ جب وہ پیرس اعلیٰ تعلیم کے لیے گئے تھے تو اپنے ساتھ تین کتابیں لے گئے تھے ، کلام مجید، کلام اقبال کا مجموعہ اور دیوان غالب (۱) ۔ انہوں نے ۱۹۶۸ء میں " غالب اور آہنگ غالب " لکھی ۔ جس کی اشاعت ۱۹۶۸ میں غالب اکیڈمی نئی دہلی کی طرف سے عمل میں آئی ۔ وہ غالب اکیڈمی کے نائب صدر اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے جنرل سیکرٹری بھی رہے ۔

نثار احمد فاروقی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی نگارشات کے بڑے مداح ہیں اور اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> "انہوں نے اردو شاعری پر عموماً اور اردو کے عظیم شعراء غالب اور اقبال پر خصوصاً جو کچھ لکھا ہے اس میں جمالیاتی ذوق ، تنقیدی بصیرت ، فلسفیانہ فکر اور تاریخی شعور کے پرتو صاف دیکھے جاسکتے ہیں (۲)

یہ کتاب ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے باب میں غالب کا زمانہ سیاسی، معاشرتی، شعرو سخن کی محفلیں ہیں۔ دوسرے باب میں غالب کے ذہن و مزاج کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کے غم تین طرح کے تھے "غم عزت" "غم روزگار" اور "غم عشق"۔ دوسرے باب ہی میں پہلے دو غموں کا تحلیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے "غالب اور آہنگ غالب" کے ابتدائی دو ابواب میں پوری آزادی فکر کے ساتھ غالب کی شخصیت اور ذہن کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ غالب کی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے نظر نہیں آتے بلکہ ان پر تاریخ اور واقعات کی روشنی میں گفتگو کرتے ہیں۔ اس زمانے کے تاریخی اور سماجی پس منظر کے بغیر ہم غالب کی شاعری کا تاریخی اور سماجی مطالعہ نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اس پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ تاریخ کا عالم ہی اس موضوع سے انصاف کر سکتا ہے۔ یوسف صاحب کا خیال ہے کہ غالب کی فکر میں تخیلی عنصر حاوی تھا اور تعقل یا تحلیلی فکر سے وہ محروم تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ غالب اپنے معاملات کو تحلیلی فکر سے نہیں سوچتے تھے۔ تخیل میں اپنی تمناؤں کی باز آفرینی کرتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ وہ عملی دنیا میں اسی طرح حاصل ہو جائیں (۳)

انہوں نے اپنے اس خیال کو اول سے آخر تک سامنے رکھا ہے اور مختلف مواقع پر اس کی روشنی میں تجزیہ و تحلیل کر کے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان سے اتفاق کرتے ہی بن پڑتی ہے۔ چنانچہ نثار احمد فاروقی کہتے ہیں۔

> "غالب کے دوسرے نقادوں نے بھی غالب کے
> فکری رویے کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی اس کمزوری
> کی طرف اشارے کیے ہیں مگر اتنی تفصیل سے اس

پہلو پر ابھی تک کسی نے بحث نہیں کی تھی" ۔(۴)

کتاب کے ابتدائی ابواب میں اور بھی کئی اہم مباحث آئے ہیں مثلاً انہوں نے غالب اور سرسید کی فکر کا موازنہ و تقابلی مطالعہ کیا ہے۔

بقول نثار احمد فاروقی کتاب کے دوسرے باب میں "غم عزت" اور "غم روزگار" "پنشن کا قضیہ" "قید فرنگ" اور "شہرت کی خواہش" ذیلی عنوانات ہیں اور ان عنوانات کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کتاب کا سب سے زیادہ اوریجنل حصہ ہے۔

تیسرے اور چوتھے باب میں غالب کے تغزل کا تجزیہ ہے اور یہ باب سترہ ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے غالب کے رنگ تغزل کے تنقیدی جائزے میں جن خصوصیات سے بحث کی ہے ان میں تخیل جدت ادا، لفظ و معانی، حکیمانہ شاعری تصوفانہ مسلک اور انسانی عظمت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ تخیلی فکر پر ان کی ایک طویل بحث ملتی ہے جس میں انہوں نے تخیل کو مختلف ذیلی عنوانات کے تحت کلام غالب کے حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ غالب کے تخیلی فکر کی بحث میں انہوں نے تخیل کے لیے مختلف عناصر کی وضاحت کی ہے۔ مثلاً تخیل کے اندرونی رمز، تخیل کے خارجی رمز، تخیل اور تخلیق، تخیل حقیقی اور غیر حقیقی، تخیل فکری، تخیل اور تحلیلی فکر۔ ان مباحث میں یوسف صاحب نے پہلی بار غالب کے کلام کے مختلف پہلوؤں کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس سے ان کے طرز تنقید کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس میں تاثراتی، تجزیاتی اور سائنٹیفک تینوں قسم کی تنقیدیں یک جان ہو گئی ہیں۔

چوتھے باب میں "تخیل کی اندرونی رمز" "تخیل کی خارجی رمز" "خیالی پیکروں کا مقابلہ اور "علامتی لفظ" عنوانات کے تحت غالب کے تغزل کی روح اور ہیئت کا تجزیہ کیا ہے

چنانچہ نثار احمد فاروقی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے تنقیدی نظریات پر تبصرہ

کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

"غالب کے تغزل کی روح اور ہیئت کا جو تجزیہ ہوا
ہے وہ بھی صرف اسی نقاد سے ممکن ہے جس نے
پوری اردو غزل کے سیاق میں غالب کا مطالعہ کیا ہو
"(۵)

چوتھے باب کا بڑا حصہ غزل کے دوسرے اساتذہ سے غالب کی غزل کا موازنہ کرنے کے لیے وقف ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے فکری تقابل اور فنی موازنے پر توجہ مبذول رکھی ہے۔

"غالب اور آہنگ غالب" کا پانچواں اور آخری باب غالب کی حکیمانہ اور متصوفانہ شاعری کے بارے میں ہے۔ نثار احمد فاروقی نے کتاب کے اس آخری حصے پر اپنی رائے یوں دی ہے:

"انہوں نے یہ ہمہ وقت پیش نظر رکھا ہے کہ وہ
ایک غزل گو کے ایسے افکار کا تجزیہ کر رہے ہیں جس
کا ذہن ایک فلسفیانہ حیرت زدگی کا شکار تھا۔ مگر وہ
اصطلاحی مفہوم میں فلسفی نہ تھا"۔(۶)

نثار احمد فاروقی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کو ایک دیدہ ور نقاد مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ایک ناقد کی حیثیت سے فنکار کی شخصیت اور اس کے فن کا مطالعہ الگ الگ کر سکتے ہیں۔ اس طرح یوسف صاحب نے غالب کے ذہن و فکر اور ان کے شاعرانہ فن کا تجزیہ کرنے میں معروضی نقطہ نظر کا ثبوت دیا ہے۔

غالب کے یہاں جو چیز چونکا دینے والی ہے وہ ان کے تخیل کی جدت ہے۔ حالی نے اپنی یادگار غالب میں ان کی جدت پسندی کو بہت نمایاں کیا ہے۔ غالب کے تغزل کی خصوصیت ان کے اعلا تخیل میں پوشیدہ ہے۔ تخیل کی اندرونی شدت جتنی زیادہ

ہو گی اتنی ہی اس کی بے عنانی کو قابو میں لانے اور اعتدال اور توازن سے اسے ہم کنار کرنے میں فکری صلاحیتوں کو صرف کرنا ہوتا ہے۔

اندرونی طوفان ہی وجدان کو ابھارتا ہے۔غالب کی شاعری کا اصلی رنگ اس اندرونی طوفان کو قابو میں لانے کے بعد نمایاں ہوا۔غالب کے تخیل کی توانائی اور رعنائی کا اصلی سبب یہ ہے کہ اس میں وجدان کے دھارے آکر مل گئے ہیں جو شاعرانہ تخلیق کا سرچشمہ ہیں۔تخیل کی گل کاریوں سے غالب کا دل حسین پیکروں سے آباد ہو گیا ہے۔ان کے نزدیک تخیل ہی اصل حقیقت ہے جو جذبے کی رازداں ہوتی ہے انسانی دل طلسمات کا سب سے بڑا مخزن ہے۔اس کے اندر عجیب و غریب عالم پنہاں ہوتے ہیں۔غالب نے اپنے تخیل کی مدد سے ان حسین طلسماتی پیکروں کو ابدی نیند سے بیدار کیا جو ان کے تحت الشعور میں سو رہے تھے۔ان کے الفاظ میں۔

ہے آدمی بجائے خود ایک محشر خیال

تخیل، حقیقی اور غیر حقیقی میں اپنے طور پر فرق و امتیاز کرتا ہے ہم تخیل کی مدد سے ذہنی لطف اندوزی میں اضافہ کر سکتے ہیں تخیل نہایت پراسرار طریقے سے حقیقت میں اپنی جذباتی آسودگی کی خاطر اضافے کرتا رہتا ہے۔دراصل ہم اس وقت تک شاعری سے لطف اندوز نہیں ہوتے جب تک ہمارا تخیل بیدار نہ ہو اور ہم جو کچھ سنیں اس کی از سرِ نو تخلیق نہ کریں۔اسی طرح جب شاعر کہتا ہے تو لفظوں میں اپنے تخیلی تجربوں کا نچوڑ بھر دیتا ہے۔اس کا تخیلی تجربوں جتنا وسیع ہو گا اتنا ہی وہ اپنے شعر میں تاثیر پیدا کر سکے گا۔

غالبؔ نے "فکر" لفظ بھی تخیل کے معنی میں استعمال کیا ہے نہ کہ تحلیلی تعقل کے لیے مثلاً ؎

ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز (۷)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں غالب کے تخیل سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"تخیل ایک طلسمی عمل ہے جو آرزو کو فریب نظر
میں تحلیل کر دیتا ہے تاکہ خود اپنی شدت میں اضافہ
کرے"(۸)

بیداری کی حالت میں تخیل کی تاثیر بہ نسبت خواب کے کم ہو جاتی ہے۔ لیکن اعلیٰ درجے کا شاعر یا آرٹسٹ اس تاثیر کو کم ہونے نہیں دیتا اس واسطے کہ اس کے شعور میں تخیل کی شمع کو جذبہ روشن کرتا ہے اور جذبے کے چراغ کو تخیل روشن کرتا ہے (۹)

غالب کے تخیل کی اندرونی رمز کے بارے میں یوسف صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے کہ غالب کے پاس دل تخیل کی اندرونی رمز ہے۔ انہوں نے بھی دل کو اپنے سے علحدہ ہستی مانا ہے۔ غالب دل کو آفت کا ٹکڑا خیال کرتے ہیں جسے کسی حالت میں چین نہیں پڑتا۔ اس کی گرمی اور رنگینی سے وہ اپنے کلام کو سجاتے ہیں۔(۱۰)

غالب کے تخیل کی خارجی رمزیت کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے یوسف صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے بھی ان کے تنقیدی رجحانات کا سراغ ملتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ شاعری میں ہئیت اور لفظ و معانی کی طلسماتی کیفیت کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ غزل میں وزن، بحر، ردیف اور قافیہ کی عروضی پابندیاں اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ہم ایک طلسماتی دنیا میں آگئے ہیں۔ اس لیے وہ اس معاملے میں حالی کے اس نقطہ نظر سے متفق نظر آتے ہیں کہ تاثر الفاظ کے طلسم کا رہین منت ہوتا ہے۔ لفظوں کی علامتوں سے جذبے کی اندرونی کیفیتوں کا اظہار ہوتا ہے اور ایک حد تک جذبات کی تخلیق بھی ہوتی ہے۔ جذبات کی پیکر تراشی بھی الفاظ ہی کی مدد سے ہو سکتی ہے۔ حسن فطرت کی عکاسی میں بھی غالب کا تخیل اور لفظیات دونوں سحر آفرینی کا کام

کرتے ہیں۔ جس میں شاعر کی دروں بینی اور ان کی تخلیقی قوت دونوں کار فرما ہوتی ہیں۔

غالب کے یہاں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن میں غالب کی منطقی فکر پر ان کی وجدانی اور تخیلی کرشمہ سازی کا اثر چھایا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر یوسف صاحب نے غالب کی ایک پوری غزل کا حوالہ دیا ہے جو ہوس گل کے اسرار اور طلسم سے پر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس غزل میں "گل" شاعر کے رنگین تخیل کا خارجی رمز بن گیا ہے۔

ہے کس قدر ہلاک فریب وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

کلام غالب کی دوسری اہم خصوصیت "جدت ادا" کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے یوسف صاحب لکھتے ہیں:

غالب کے تغزل کی اہم خصوصیت جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے ان کا طرز ادا ہے جسے اردو زبان کی شاعری کے لیے سرمایہ نازش خیال کرنا چاہئے۔ ان کے کلام کی بلاغت اور حسن بیان کا کوئی دوسرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

غالب کے طرز ادا نے معمولی لفظوں کو بے پناہ تاثیر، قوت اور تازگی عطا کر دی ہے۔ اپنے ابتدائی کلام میں انہوں نے ثقیل الفاظ اور پیچیدہ ترکیبیں استعمال کیں لیکن جب انہوں نے محسوس کیا کہ اردو زبان ان کی متحمل نہیں ہو سکتی تو اپنے اسلوب کی خود اصلاح کر لی اور اپنا خاص طرز ایجاد کیا جو ان ہی کے لیے مخصوص رہا۔ وہ اپنی غزلوں میں رمز و کنایہ سے ایک خاص قسم کی فضا پیدا کر دیتے ہیں جو اپنے اندر ابہام کی گہرائی بھی رکھتی ہے۔ کنایہ کے استعمال سے لفظوں میں جو تیکھا پن آجاتا ہے وہ دراصل الفاظ کو انوکھے انداز میں برتنے سے پیدا ہوتا ہے اور یہ کمال غالب میں تھا کہ انہوں نے نہ صرف فرسودہ اور پامال الفاظ کو نئے معانی پہنائے بلکہ اور منفرد

اچھوتے انداز میں ان کو باندھ کر اردو غزل کو ایک نئی تازگی اور حرارت بخشی۔

یوسف صاحب کی نظر میں غالب کی جدت ادا کی خصوصیت ہم کو ان کے تخیل میں، جذبہ میں اور ان کی لفظیات میں یکساں طور پر ملتی ہے۔ غالب کی معانی آفرینی کا اندازہ ہم کو ان کے بے شمار اشعار سے ہوتا ہے۔ یوسف صاحب نے بھی اپنے تنقیدی جائزے میں ان کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔ چنانچہ انہوں نے لفظ اور معانی کے عنوان سے بھی غالب کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے غالب کے نظریہ شعر" شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں" کو مدنظر رکھتے ہوئے لفظ و معانی کی بحث میں جن تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ غاب کے تغزل میں مالیاتی صداقت کا انکشاف مختلف پیرایوں میں ہوا۔ ان کے کلام میں کہیں حسن و عشق کی واقعہ نگاری اور اس کے سارے لوازمات ملتے ہیں۔ کہیں رندانہ جسارتوں کی بلند آہنگیاں اور شوخیاں ہیں اور کہیں زندگی کے رازوں کی حکیمانہ تعبیر و توجیہ ہے۔ ان کی داخلیت اور خارجیت دونوں ایک دوسرے میں سموئی ہوئی ہیں۔ خارجیت جب غزل میں برتی جاتی ہے تو محبوب کے خد و خال، لب و دندان، چال ڈھال، زلف و رخسار اور قد و قامت کے بیان میں شاعر اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ داخلی زندگی کے احوال پیش کرنے کی نوبت نہیں آتی حالانکہ اصلی تغزل بغیر اس کے ممکن نہیں۔

غالب کی دروں بینی اپنے مجازی رنگ کے باعث اسی دنیا کی چیز ہے۔ ان کے یہاں جذبے اور تخیل نے حسی تجربے کی تہذیب کی اور شعور نے تحت شعور کے خزانوں کو کھنگالا تاکہ زندگی کے تضاد کو دور کر کے صحیح اور متوازن جمالیاتی قدروں کی تخلیق ہو۔ چاہے مضمون کچھ ہی کیوں نہ ہو، غالب کے لب و لہجہ کی متانت اور احساس کا رکھ رکھاؤ اور لفظوں اور ترکیبوں کی موزنیت اور رمزی اثر آفرینی دلوں کو لبھاتی ہے۔

غالب کے یہاں جذبے۔ فکر و تخیل کا جو توازن اور امتزاج ہے وہ ہمارے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ انہوں نے اپنے کلام میں منطقی اور تحلیلی فکر کی بجائے تخیلی فکر کی رہبری قبول کی ہے۔ جس کے بغیر اعلیٰ درجے کا تغزل ممکن نہیں۔(۱۱)

غالب کے یہاں لفظ و معانی میں دوئی نہیں ملتی بلکہ وہ دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں۔ اپنے کلام کی طلسمی تاثیر کا خود غالب کو بھی احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس بات کا دعویٰ بھی کیا تھا۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں کہ غالب نے آئینہ کو رگڑ کر اس میں صفائی اور چمک پیدا کرنے کا جو ذکر کیا ہے اس سے ان کی مراد صرف لفظوں کی چھان پھٹک تراش خراش اور ان کے برمحل استعمال کا سلیقہ معلوم کرنا ہے۔ غزل گو شاعر اپنے اندرونی تجربوں کو تخیل کی زبان میں بیان کرنے کے لیے کبھی معانی کے لیے موزوں لفظ اور کبھی لفظوں کے لیے معانی تلاش کرتا ہے۔ اس کوشش میں شعر میں ایک خاص قسم کا ترنم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ شاعر کا تخیل زبان اور معانی دونوں میں قدر مشترک ہے اور اس سے دونوں میں رشتہ اور ربط پیدا ہوتا ہے۔ معانی کے بلاغت کا انحصار لفظوں کے برجستہ اور موزوں استعمال پر ہوتا ہے اسی سے حسن کی جلوہ گری ہوتی ہے جس کے بغیر کلام میں تاثیر نہیں آتی۔

یوسف صاحب کا خیال ہے کہ علم و نظر کی وسعت سے شعر کے معانی میں بھی وسعت آجاتی ہے۔ بعض مخصوص شعری علامتوں یا تلمیحوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ کہیں صنائع و بدائع سے شعر کے لفظوں کی نشست و ترتیب میں حسن پیدا کیا جاتا ہے۔ لفظی اور معنوی صنعتوں سے شاعر کو اپنے تخیل کے پرواز میں مدد ملتی ہے۔

پیکر تراشی کا تصور جدید تنقیدی ذہن کی دین ہے۔ یوسف صاحب کے

تنقیدی شعور میں ہم کو یہ رجحان بھی ملتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کلام غالب میں پیکر تراشی کے بعض عمدہ نمونوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غالب نے تمثیلی انداز میں اپنے خیالی پیکروں کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے کبھی یہ پیکر ایک دوسرے کے مقابل اور حریف نظر آتے ہیں تو کبھی غالب نے ان خیالی پیکروں کا ایک دوسرے سے موازنہ بھی کیا ہے بقول ان کے اس تکنیک کے برتنے میں بھی غالب بڑے کامیاب رہے ہیں۔ (۱۲)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں کہ ہماری زبان کے شاعروں نے صنعت مقابلہ کو خاص طور پر برتا ہے۔ غالب کے یہاں بھی اس کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں غالب کا کمال تو یہی ہے کہ ان کے کلام میں حسن تخیل متحرک انداز میں جلوہ گر ہے۔ اس نقطہ نظر سے غالب کا کلام ایک مستقل مطالعہ کا متقاضی تھا۔ انہوں نے "غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات" کے عنوان سے مستقل کتاب لکھی ہے۔

غالب کے یہاں اس قسم کے پیکری مقابلوں کی بیسیوں مثالیں موجود ہیں۔ جن میں استعارہ، تشبیہ اور تمثیل سب کو برتا گیا ہے۔ یوسف خاں صاحب کی نظر میں یہ سب محاسن کلام میں داخل ہیں۔ مثلاً ذیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجوم اشک میں تار نگہ نایاب تھا

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

علامتی لفظ کی بحث میں بھی ڈاکٹر صاحب کو اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے پہلی بار غالب کے کلام کا اس پہلو سے ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔

اردو غزل میں بعض علامتی لفظ بھی فنی اعتبار سے برتے گئے ہیں جن سے ایک خاص قسم کی ایمائی فضا کی تخلیق ہوتی ہے۔ مثلاً جنوں سامانی، جیب و گریباں، زنجیر پائی، موج خوں، آشیاں، قفس اور برق وغیرہ وغیرہ۔ غزل میں ان لفظوں کی حیثیت اصطلاحی ہو گئی ہے۔ غالب نے نہ صرف قدیم علامتی الفاظ کو برتا ہے بلکہ اپنے طور پر بھی بیشتر الفاظ کو نئی اصطلاحوں کے ساتھ اختراع و ایجاد کیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں غالب کی ان ایجادات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس سے غالب کے ذہنی رجحان کے حرکی اور قوت آفریں ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ مثال کے طور پر سیر اور سیلاب کا لفظ غالب کے یہاں جس مفہوم میں برتا گیا وہ شاید ہی کسی اور کے یہاں ملتا ہے۔

" رنگ و بو کے شعری محرک " اس ذیلی عنوان کے تحت تجزیاتی تنقید میں انہیں اولیت حاصل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ غزل ایک طرح کی طلسمی دنیا ہے۔ غزل لکھنے والا شاعر اس طلسم کے بھیدوں کو جانتا ہے اسے لفظوں کے استعمال کی ایسی قوت عطا کی گئی ہے جسے دوسرے مشکل سے سمجھ سکتے ہیں۔ شاعرانہ لفظ انسانی ذہن کو ان بندھنوں سے رہا کرتے ہیں اور ان سے جذبے اور تخیل کی بے پناہ پوشیدہ قوتوں کی جلوہ گری ہوتی ہے۔

رنگ و بو کو غزل گو شاعر عشق و محبت کے عینی رمز کے طور پر برتتا ہے۔ رنگ و بو میں زندگی کی تازگی اور لطافت بھی مضمر ہے۔ غالب کے نزدیک بہار جو زندگی کی بار آوری اور شادابی سے عبارت ہے طوفان رنگ کے سوا کچھ نہیں۔ (۱۳)

یہ مصوری کی کیفیت جو سادہ آنکھوں سے رنگوں کے فرق کو ظاہر کرے اور مصور کی طرح انہیں برتے۔

حسرت کا ایک شعر ہے ؎

گھٹا اور بجلی میں ہے آج چوٹ
اودے ڈوپٹے پر لچکے کی گوٹ

اقبال کی شاعری میں مصور کی آنکھ کار فرما ہے۔

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

غالب اپنے زور تخیل سے گل کاری کرتا ہے جو تخیل کی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے ظاہر کی آنکھ نہیں۔ چنانچہ غالب کا شعر ہے۔

ایک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیئے ہوئے

اس لیے ایک چغتائی یا اللہ بخش کے موقلم ہی ان تخیلی تصویروں میں رنگ بھر سکتے ہیں عام قاری نہیں۔

غالب نے اپنے فارسی شعر میں یہ مضمون باندھا ہے کہ بزم عالم میں رنگ کا پیمانہ گردش میں ہے۔ ہستی کے طوفان بہار کے آگے خزاں کو شکست کھانی پڑتی ہے۔ ایک اردو شعر میں بھی زماں و مکاں کی کیفیت کو گردش رنگ چمن تشبیہ دی ہے

عمر مری ہوگی صرف بہار حسن یار
گردش رنگ چمن ہے ماہ و سال عندلیب

غرض رنگ و بو کی اصطلاحوں نے مختلف حرکیاتی مضامین کو باندھا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ مصحفی، حسرت اور اقبال رنگوں کو جس خارجی کیفیت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں غالب کے یہاں اس کا شائبہ کم ہے۔ غالب بہار آفریں رنگوں کو ان کی داخلی کیفیت کے ساتھ استعمال کرتا ہے اس فرق کی یوسف صاحب نے نشاندہی نہیں کی۔

غالب کے تغزل کو سمجھنے کے لیے اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ انہوں نے معنی آفرینی کے ساتھ شعر کی ظاہری شکل و صورت اور نوک و پلک سنوارنے پر خاص طور پر توجہ دی ۔یوسف صاحب نے کلام غالب کی خارجی خصوصیات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ شاعرانہ اظہار میں ضبط و توازن کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ہیئت کی تخلیقی وحدت رونما ہو ۔شعر کا سارا طلسم اس کی بلاغت میں مضمر ہوتا ہے جو لفظ اور معنی دونوں پر حاوی ہوتا ہے۔

غالب کو علم معانی و بیان سے واقفیت تھی جس کا اظہار ان مختلف بحر و اوزان سے ہوتا ہے جو انہوں نے اپنی غزلوں میں برتے ہیں ۔ان کی تجزیاتی تنقید کے مطابق غالب کے تخیل نے غزل کے خارجی لوازم سے پورا فائدہ اٹھایا ہے لیکن کہیں بھی تخیلی پرواز کو ان کا پابند نہیں کیا۔ غالب شاعری کو آتش کی طرح مرصع سازی نہیں سمجھتے تھے ۔(۱۴) کیونکہ وہ ان کے نزدیک ایک روحانی اور طلسمی چیز تھی جس میں تقدس کا عنصر بھی شامل تھا۔اس لیے بعض جگہ وہ اپنے نغمے کی صداقت کو وحی اور الہام سے قریب تر گردانتے ہیں اسکا سرچشمہ ان کے نزدیک ماورائے عقل و تعقل ہے (۱۵)

تخیل آزادی کا نقیب ہوتا ہے ۔جہاں آزادی ہوگی وہاں تخیل کی کارفرمائی ہوگی اور جہاں تخیل ہوگا وہاں آزادی بھی ضرور ہوگی شاعرانہ تجربہ اس آزادی کی فضا میں پروان چڑھتا ہے ۔ان کے نقطہ نظر میں غالب کے تغزل میں نظم و وحدت کا اصول جذبے اور تخیل کے امتزاج میں پنہاں ہے (۱۶)

ہیئت شاعر کے تخیلی عمل سے الگ نہیں ہوتی بلکہ معانی کی طرح جذبے اور تخیل کا جزو ہوتی ہے ۔ بعض اوقات اگر معانی کی ندرت موجود نہ ہو تو بھی ہیئت کا جمالیاتی تاثر ہمیں اپنی جانب متوجہ کرلیتا ہے ۔ہیئت سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شعر کی خاص طور پر غزل کے شعر کی خارجی ہیئت کا دار و مدار لفظوں اور

ترکیبوں کے موزوں استعمال پر ہے جس میں عروضی قاعدے ردیف اور قافیے، بحر اور زمین شعر کے رنگ کو نکھارنے میں مدد دیتے ہیں۔ لفظوں کو اگر صحیح اور موزوں طور پر استعمال کیا جائے تو وہ خود معانی بن جاتے ہیں۔ جس طرح موسیقی کے بول ہوتے ہیں اسی طرح شعر کی ہئیت میں موزوں الفاظ کا انتخاب بھی بحر میں ایک ترنم کی کیفیت پیدا کر سکتا ہے۔

یوسف صاحب کا خیال ہے کہ غزل کے شعر کی طلسمی کیفیت اسی وقت مکمل ہوتی ہے جب لفظ اور معنی ہم آہنگ اور مقتضائے حال کے مطابق ہوں۔ اس سے طرز ادا کی دل نشین عبارت ہے جو کسی ایک خیال یا حسن کے کسی ایک لمحہ کو ابدی بنا دیتی ہے۔

کسی شاعر کی عظمت کا اندازہ اس کے استعاروں کی قوت، تازگی اور بلندی سے کیا جا سکتا ہے جو معانی اور بیان کی جان ہوتے ہیں۔ ان کی نظر میں استعارہ رمز آفریں ہوتا ہے۔ اس لیے جذبے اور اندرونی تجربہ کی تصویر اس سے بہتر کھینچنے والا کوئی اور ذریعہ کلام نہیں۔ ایک ایسے دور میں جب کہ تمام شاعر استعارے کو روایتاً باندھتے تھے غالب نے استعارے کو ایک مجموعی کیفیت کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا کلام پہلو دار ہو گیا ہے۔(۱۷)

کلام غالب کی داخلی خصوصیات میں سب سے پہلے جو چیز زیر بحث آتی ہے وہ خود غالب کا نظریہ شعر ہے جس کا حوالہ ہم کو غالب پر لکھی گئی اولین سوانح تصنیف یادگار غالب میں ملتا ہے۔ جو غالب پر خواجہ الطاف حسین حالی کی اولین تصنیف ہے۔ لکھا ہے کہ غالب کی نظر میں شاعری معنیٰ آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔ دوسری اہم خصوصیات غالب کا تصوفانہ مسلک ہے جس کو انہوں نے اپنے اشعار میں جا بجا فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ غالب کی اس خصوصیت کا یوسف صاحب نے حکیمانہ شاعری کے عنوان سے جائزہ لیا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے پہلی بحث غالب کے

تصوفانہ مسلک یعنی وحدت الوجود کی آتی ہے ۔ فارسی اور اردو غزل میں وحدت الوجود کے تذکرے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایرانی اور ہندوستانی غزل گو شاعروں کی طرح غالب پر بھی وحدت الوجود کے فلسفے کا اثر تھا ۔ (۱۸)

وہ ان معنوں میں کوئی فلسفی نہیں تھے کہ اپنے افطار کو کسی خاص نظام اور مکتب خیال کے تحت مرتب کرتے وہ مذہبی رسوم وشعائر کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے ۔ (۱۹) اگر کوئی ان کا عقیدہ تھا تو بس یہ تھا ۔ وحدت الوجود میں ان کے خیال کی مرکزیت ملتی ہے ۔ غالب نے حیات وکائنات کی حقیقت کو اسی کے توسط سے سمجھنے کی کوشش کی ہے وحدت الوجود کا مسلک بھی غالب کے یہاں ان کے تخیلی فکر کے تابع ملتا ہے ۔ یوسف صاحب اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ تصوف کے روحانی تجربوں سے غالب کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی ۔ وہ وحدت الوجود کو ذہنی طور پر مانتے تھے ۔ کلام غالب کے اس پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے جرات مندی اور بیباکی کے ساتھ اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ایک صحت مند تنقیدی روش کا ثبوت ملتا ہے انہوں نے کسی قسم کی جانبداری اور وابستگی کو برتے بغیر برملا یہ کہا ہے ۔

غالب کو دنیا کے تماشوں اور لذتوں کی عمر بھر ہوس رہی ۔ اپنے مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے غالب پکے دنیادار تھے ۔ وہ ہمیشہ نسوانی حسن کے قدردان اور اس پر تصرف حاصل کرنے کے خواہشمند رہے ۔ خواہشوں اور آرزؤں نے کبھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا (۲۰)

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غالب کے یہاں وحدت الوجود کا جو مسلک ملتا ہے وہ صرف اس حد تک ہے

کہ اس سے انہوں نے اپنی فکر کو گہرائی اور گیرائی عطا کی ہے۔غالب نے اپنے وحدت الوجود کے مسلک سے بے شمار فلسفیانہ مضامین کو اپنے اشعار میں باندھا ہے۔جس سے غزل میں وسعت اور فکر میں گہرائی اور گیرائی آئی ہے۔

غالب کے وحدت الوجود کے مسلک میں نفی۔ذات کا تصور بھی موجود تھا۔وہ اس بات کے قائل تھے کہ انسان اپنی ہستی کو مٹا کر اپنے آپ کو ذات حقیقی میں جذب کر لے تو وہ فنافی الذات ہو کر دوامی زندگی حاصل کر لے گا۔چنانچہ ایک مقام پر کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

غالب کے مسلک وحدت الوجود کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ فنائیت کے قائل ہوتے ہوئے بھی انسانی عظمت کے منکر نہیں ہیں۔یوسف صاحب کو اس بات پر سخت حیرت ہے۔غالب کائنات کو فریق نظر جانتے ہوئے بھی انسانی عظمت کو مانتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ انسانی فضیلت کے متعلق غالب کا خیال وہی ہے جو اسلامی روایات میں ملتا ہے۔قرآن کریم میں انسانی فضیلت اور عظمت کو مختلف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔حتیٰ کہ انسان کو فرشتوں پر بھی شرف بخشا گیا ہے۔انسانی حرمت و عظمت کو پامال ہوتے ہوئے دیکھ کر کبھی کبھی وہ احتجاجاًیوں بھی کہتے ہیں۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی۔ فرشتہ ہماری جناب میں

یوسف صاحب کی نظر میں یہ ایک غالب کی فطری جدت پسندی ہے کہ انہوں نے تصوف کے مروجہ روایاتی نظریات سے یکسر انحراف کیا ہے چنانچہ غالب اپنی آزادی کی قدر کرتے تھے۔وہ کہتے ہیں کہ غم دنیا کے باوجود ہم نے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے

کی کوشش کی ۔ہماری زندگی کے غم خانے کی تاریکی کو ہم شمع کی بجائے برق سے روشن کرتے ہیں ۔

برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

جس طرح برق ایک آن میں چمک کر غائب ہو جاتی ہے ۔اسی طرح ہمارے غم کا اثر بھی تھوڑی دیر رہ کر غائب ہو جاتا ہے ۔یہ ہماری آزاد روی کی دین ہے کہ ہم غم کے غلام نہیں بنے ۔(۲۱)

کائنات کے مقابلے میں انسان کی خفتہ صلاحیتوں کی برتری کا احساس دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان میں قدرت کی طرف سے جو جوہر ودیعت کیا گیا ہے اگر وہ اس کو بروئے کار لائے تو اس ساری کائنات کی وسعتوں کو ایک ہی قدم میں طے کر سکتا ہے اور دوسرے قدم کے لیے اس قدرت سے یہ سوال کرنا پڑے گا یہ اب میرا دوسرا قدم کہاں رکھنا ہو گا ۔ ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

نثار احمد فاروقی نے غالب اور آہنگ غالب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

"زندگی بھر کا تفکر اور مشاہدہ اور مطالعہ اپنے بہترین قوام کے ساتھ مرکب ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ ایسی ہی فکر انگیز کتاب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جیسی "غالب اور آہنگ غالب" ہے ۔اس میں غالب کی شخصیت ، ماحول اور فن کی سہ جہاتی وحدت کو نئے انداز سے پڑھنے اور اس کی تعبیر کرنے کا ایک نیا راستہ ہمیں دکھایا گیا ہے ۔"(۲۲)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے کلام غالب کا بہت شرح وبسط اور دیدہ ورانہ گرفت کے

ساتھ بھرپور تجزیہ کیا ہے ۔انہوں نے بعض اہم نکتوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی ہے جن کا اتنی گہری نگاہ سے ابھی تک کسی غالب شناس نے جائزہ نہیں لیا تھا۔

حوالے

---

(۱) صباح الدین عبد الرحمن، بزم رفتگان، (۲) صفحہ (۲۶۱)
(۲) نثار احمد فاروقی، ہماری زبان، صفحہ (۱)
(۳) نثار احمد فاروقی، ہماری زبان، ماخوذ صفحہ (۱)
(۴) نثار احمد فاروقی، ہماری زبان، صفحہ (۳)
(۵) نثار احمد فاروقی، ہماری زبان، صفحہ (۳)
(۶) نثار احمد فاروقی، ہماری زبان، صفحہ (۳)
(۷) ڈاکٹر یوسف حسین خان، غالب اور آہنگ غالب، ماخوذ صفحہ (۱۳۸)
(۸) ڈاکٹر یوسف حسین خان، غالب اور آہنگ غالب، صفحہ (۱۴۶)
(۹) ڈاکٹر یوسف حسین خان، غالب اور آہنگ غالب، ماخوذ صفحہ (۱۴۶)
(۱۰) ڈاکٹر یوسف حسین خان، غالب اور آہنگ غالب، ماخوذ صفحہ (۱۴۶)
(۱۱) ڈاکٹر یوسف حسین خان، غالب اور آہنگ غالب، ماخوذ صفحہ (۱۶۹-۱۶۸)
(۱۲) ڈاکٹر یوسف حسین خان، غالب اور آہنگ غالب، ماخوذ صفحہ (۱۹۴)
(۱۳) ڈاکٹر یوسف حسین خان، غالب اور آہنگ غالب، ماخوذ صفحہ (۲۱۳)
(۱۴)

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع سازی کا

(۱۵)

آگے ہیں غیر سے مضامین خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

(۱۶) ڈاکٹر یوسف حسین خان، غالب اور آہنگ غالب، ماخوذ صفحہ (۲۲۸)

(۱۷) ۔ڈاکٹر رفیع رؤف غالب فخر روزگار دلی ماخوذ صفحہ (۱۲۷)

(۱۸)

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

(۱۹) ہم موجد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم

(۲۰) ۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں غالب اور آہنگ غالب صفحہ (۲۳۲)

(۲۱) ۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں غالب اور آہنگ غالب صفحہ (۲۶۰)

(۲۲) ۔ نثار احمد فاروقی غالب اور آہنگ غالب ۔ہماری زبان ۔ انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) ۔۲۲/ فبروری ۱۹۷۶۔ صفحہ (۸)

حافظ اور اقبال

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تنقیدی نگارشات میں "حافظ اور اقبال" ایک اہم تنقیدی کتاب ہے ۔ جس کی اشاعت ۱۹۷۶ء میں عمل میں آئی ۔ یہ کتاب چار سو بارہ (۴۱۲) صفحات پر مشتمل ہے اور حسب ذیل پانچ ابواب میں منقسم ہے۔

پہلا باب: ۔ حافظ اور اقبال (اس میں حافظ اور اقبال کے تاریخی اور سیاسی حالات اور ان کے عہد کے تقاضوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرا باب: ۔ حافظ کا نشاط عشق

تیسرا باب: ۔ اقبال کا تصور عشق

چوتھا باب: ۔ حافظ اور اقبال میں مماثلت اور اختلاف

پانچواں باب: ۔ محاسن کلام

کتاب کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مختلف محرکات میں سے ایک اہم وہ اعتراض بھی ہے جو اقبال پر اس زمانے میں عام طور پر ہو رہا تھا کہ انہوں نے اپنی مثنوی "اسرار خودی" میں حافظ کے تعلق سے جن خیالات کا اظہار کیا وہ نہ صرف حافظ کی شان میں گستاخی کے مترادف سمجھا گیا بلکہ یہ ان کے تصوفانہ مسلک اور شاعرانہ عظمت کو متاثر کرنے کی ایک شعوری کوشش سمجھی گئی ۔ پرستاران حافظ کی

طرف سے کچھ اس شدت کے ساتھ اقبال پر اعتراضات کیے گئے کہ اقبال بھی ان کی تاب نہیں لاسکے اور انہیں اپنی مثنوی "اسرار خودی" کے دوسرے ایڈیشن میں ایسے تمام اشعار کو حذف کرنا پڑا جن سے لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہو چلا تھا کہ اقبال، حافظ کے قائل نہیں ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی اس تصنیف "حافظ اور اقبال" کے ذریعے اسی غلط فہمی کو دور کرنے کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال حافظ کے سراسر خلاف نہیں بلکہ غزل گوئی میں تو اردو کے بیشتر شعرا میں سب سے زیادہ اقبال ہی حافظ کا پیرو نظر آتا ہے۔ بلاشبہ اس تنقیدی کتاب کو ادبی دنیا میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا ایک جرات مندانہ اقدام قرار دیا جاسکتا ہے۔

دوسری وجہ اس تصنیف کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے صنف غزل سے اپنی فطری وابستگی کے سبب حافظ اور اقبال کے تغزل کو اپنے تنقیدی افکار کی جولان گاہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ حافظ اور اقبال سے پہلے ان کی جتنی بھی ادبی نگارشات معرض وجود میں آئیں ان سب کا مشترکہ موضوع صنف غزل ہی رہا ہے جیسے "روح اقبال" "اردو غزل" "غالب اور آہنگ غالب" اور "حسرت کی شاعری" ان تمام تصانیف کے مطالعہ سے قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا پسندیدہ موضوع اردو ادب کی اہم ترین صنف شعری "اردو غزل" ہے۔ غزل کے مطالعہ میں ان کا فطری ذوق جب مختلف عنوانات سے وسعت پاتا گیا تو اس ذوق کی تکمیل کے نتیجے میں یہ تمام ادبی نگارشات یکے بعد دیگرے وجود میں آتی گئیں۔ ہمارے اس خیال کی تائید ڈاکٹر عبدالمغنی کے حسب ذیل خیالات سے ہوسکتی ہے۔

> "اردو ادب پر لکھی ہوئی ان کتابوں کے عنوانات یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ ان کے مصنف کی دلچسپی کا خاص دائرہ شاعری بالخصوص غزل ہے۔ "اردو غزل" کے علاوہ غالب اور حافظ غزل گو ہیں ہی

اقبال کے ساتھ حافظ کے موازنے کی جہت بھی
تغزل ہے ورنہ اقبال اور حافظ کے موازنے کا نہ
کوئی مطلب ہے اور نہ ضرورت۔ اس لیے کہ حافظ
صرف تغزل کے شاعر ہیں اور ان کے فن میں تفکر
اور تمدن کا وہ عنصر تقریباً مفقود ہے جو اقبال کا مواد
شاعری ہے"۔(۱)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تصنیف "حافظ اور اقبال" کے پہلے باب میں ڈاکٹر صاحب کے صحت مند تنقیدی نظریات کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اقبال اور حافظ کے ذہنی اور فکری تضاد کے ساتھ منصفانہ طرز تنقید کو اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر اقبال کو حافظ سے کچھ اختلاف ہے بھی تو وہ دونوں کے اپنے اپنے عہد کے تقاضوں کا اختلاف ہے۔ دونوں کے مختلف تاریخی، سیاسی، سماجی حالات کو مدنظر رکھے بغیر کوئی ناقد بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اقبال کو اگر حافظ سے اختلاف ہے تو کن وجوہات کی بنا پر ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اس کتاب کے پہلے باب میں ان ہی وجوہات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے حافظ کے عہد کے ساتھ ساتھ اقبال کے دور انقلاب کا بھی جائزہ لیا ہے اور لکھتے ہیں کہ اقبال کی شاعرانہ فکر جب پروان چڑھی تو اس وقت تقریباً سارا عالم اسلامی اور ایشیاء کے دوسرے ملک سامراجی شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا انحطاط حد کو پہنچ چکا تھا۔ غیر قوم کی غلامی، پستی اور بے چارگی، معاشرتی انتشار، علم و فن میں پسماندگی یہ تھی ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت۔ سرسید احمد خاں کی تحریک نے نیند کے ماتوں کو جھنجوڑ کر اٹھایا تھا لیکن انہیں اپنے اوپر اعتماد نہیں تھا۔ خود شناسی کوسوں دور تھی۔ وہ دوسروں کے سہارے جی رہے تھے۔ لیکن کوئی جماعت دوسرے کے سہارے زندگی کی دوڑ میں

آگے نہیں بڑھ سکتی ۔ اقبال کی شاعری کا مقصد اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے احوال بدلنے سے احساس و فکر کی صورتیں بھی بدلتی ہیں جن کا عکس اس زمانے کے فن میں نظر آتا ہے ۔

اقبال نے ہندوستان کے مسلمانوں کے علاوہ عالم اسلامی اور ایشیا کی دوسری قوموں کی ابتری اور انحطاط کا گہرا مطالعہ کیا تھا ۔ ہندوستان کے مسلمان مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد انتہائی پستی اور بے بسی کا شکار ہو گئے تھے ۔ ترکستان ، شمالی مغربی چین ، انڈونیشیا ، ملیشیا اور شمالی افریقہ کے مسلمان غلامی میں مبتلا تھے ۔ ایسے وقت میں اقبال نے اپنی شاعری کو اجتماعی معنویت کے لیے وقف کر دیا ۔ خودی کے استحکام کے ساتھ جدید تعلیم کی طرف زور دیا ۔ اس لیے اس نے اپنے عہد کے خانقاہی تصوف کی سکون آمیز درون بینی کی بجائے متحرک قسم کی برون بینی کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ انفس و آفاق دونوں کی بصیرت نئی نسل میں پیدا ہو سکے ۔

جس تہذیب کے سائے میں حافظ شیرازی نے آنکھ کھولی اس میں مشرقی اقوام کو سامراجی طاقتوں کا سامنا نہیں تھا اور نہ ہی اس وقت اسلامی تہذیب کو اس قسم کے خطرے در پیش تھے جو سیاسی غلامی کا لازمی نتیجہ سمجھے جاتے ہیں ۔ تیمور نے اسلامی ملکوں کو اپنی ترکتازیوں سے ضرور درہم برہم کر دیا تھا لیکن اسلامی تہذیب کے چوکھٹے میں کوئی رخنہ نہیں پیدا ہوا ۔ قوت و اقتدار کے جھگڑے آپس کے تھے غیروں کے نہ تھے ۔ مشرق سے مغرب تک مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا بول بالا تھا اور اسلامی تہذیب کی بنیادیں مضبوط تھیں اور ہاں اگر کسی بات کی کمی تھی تو معاشرتی اقدار کا کھوکھلا پن تھا جو زیادہ تر ظاہرداری ، ریاکاری ، تن آسانی اور سہل پسندی وغیرہ تھے ۔ اس لیے حافظ نے معاشرتی زندگی کی طہارت کو بطور خاص اپنا موضوع بنایا ہے ۔ اس نے علماء ، صوفیاء ، زاہد ، واعظ اور شحنہ ، سب کو اپنے شیریں طنز کا نشانہ بنایا ہے اور ان کی قلعی کھولنے کی کوشش کی ہے ۔

ان دو مختلف تاریخی، سماجی اور سیاسی حالات کے مد نظر حافظ نے اپنے عہد کے تقاضوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اقبال نے اپنے عہد کے تقاضوں کی تکمیل کی ہے۔دونوں شعرا. کے ذہنی افکار میں، تصورات میں جو بعد و اختلاف ملتا ہے اسی تاریخی اور سیاسی اختلافات کا بعد ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حیات انسانی کے تعلق سے مختلف رویوں کو اپنایا ہے اور تصور عشق کے معاملے میں بھی دونوں نے الگ الگ راہوں کو اختیار کیا۔ان امور کا مطالعہ ہی حافظ اور اقبال کے تصور عشق اور تصور حیات کا مطالعہ بن جاتا ہے۔چنانچہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے یہاں یہ مطالعہ دو وسیع ابواب پر محیط ہے۔ایک باب " حافظ کا نشاط عشق "اور دوسرا" اقبال کا تصور عشق " ہے۔

حافظ کے تصور عشق پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں کہ حافظ کے یہاں جو رندی و مستی کی کیفیت ملتی ہے وہ اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ حافظ نشاط عشق کا قائل رہا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج تک اس کا فیصلہ نہیں ہو سکا کہ حافظ کا عشق مجازی ہے یا حقیقی۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں کہتے ہیں کہ شاعرانہ پیرائے میں جو عشقیہ مضامین بیان ہوتے ہیں ان کی افہام و تفہیم میں یہ تقسیم ہی بنیادی طور پر غلط ہے کہ شاعر نے کس شعر میں عشق حقیقی کو باندھا ہے اور کونسا شعر عشق مجازی سے عبارت ہے کیونکہ یہ احساس تو پڑھنے والے کے جذبات پر منحصر ہوتا ہے کہ اگر کوئی صوفیانہ مزاج رکھتا ہو تو مجازی کو بھی عشق حقیقی کے مفہوم میں لے اور کوئی شخص محض عاشقانہ مذاق رکھتا ہو وہ عشق حقیقی میں بھی عشق مجازی کے پہلو نکال لے گا۔اسی لیے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا یہ خیال درست ہے کہ حافظ کے یہاں حقیقت اور مجاز ایسے گھلے ملے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے علحدہ نہیں کیا جاسکتا۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حافظ کا اصل رنگ مجازی اور انسانی ہے۔وہ جو کچھ کہتا ہے اس میں انسانی تجربوں کی ترجمانی ملتی ہے۔اس کے عشق میں

انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس کے رموز و علائم انسانی حسن و جمال کی کیفیات سے لبریز ہیں جو ہمیشہ سے فنی تخلیق اور نشاط و سرمستی کا سامان مہیا کرتے رہے ہیں۔ایسے رندانہ اشعار سے ہی دراصل حافظ کی شاعرانہ شخصیت ابھرتی ہے۔اس کے یہاں حسن و عشق زندگی کی تمثیل ہیں۔

ایک بات جو حافظ کے پورے کلام میں خصوصیت سے ملتی ہے وہ یہ کہ حافظ ہر اعتبار سے ایک عاشق صادق ہے۔مجاز ہو کہ حقیت اس کے عشق کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔وہ انسان کا بھی عاشق ہے، خدا کا بھی اور خود عشق کا بھی۔بعض اوقات حافظ نے شیراز کے ان سلاطین اور امرا. کو جو اس کے محسن تھے ان سے بھی وہ اپنے محبوب کے طور پر خطاب کرتا ہے۔

حافظ کے کلام میں شاعرانہ اور صوفیانہ تجربے بھی ایک دوسرے میں حل ہوگئے ہیں۔ان دونوں تجربوں کی رمزیت اور پراسراریت اس کے جذبے اور تخیل کا جزو بن کر رنگ و آہنگ میں نمایاں ہوتی ہے۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے حافظ اور اقبال کے تصور عشق کا موازنہ انتہائی تفصیل کے ساتھ کیا ہے لیکن وہ اہم موضوع جو اقبال کو حافظ سے جدا کرتا ہے یعنی تصوف اس موضوع پر ہمیں اس کتاب میں کوئی علحدہ باب نہیں ملتا۔البتہ حافظ اور اقبال کے تصور عشق کے تقابلی جائزے میں اور حافظ اور اقبال کے خیالات میں مماثلت اور اختلاف کے باب میں ضمنی طور پر ہمیں وہ اشارے مل جاتے ہیں جن کی مدد سے ہم حافظ کے تصوفانہ مسلک اور اقبال کے تصوفانہ خیالات سے آگہی حاصل کر سکتے ہیں۔

جہاں تک تصور عشق کا تعلق ہے یوسف صاحب نے مختلف مثالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال عشق کے معاملے میں بڑی حد تک حافظ کا ہم نوا ہے البتہ جہاں عشق کے مقصود بالذات اور عشق کے اجتماعی تقاضوں کا سوال آتا ہے وہاں حافظ اور اقبال میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں کہ حافظ اور اقبال دونوں ہی عشق کی بات کرتے ہیں، اقبال عشق کی قوت محرکہ سے انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے جب کہ حافظ کے سامنے عشق کا کوئی اجتماعی مقصد نہیں وہ عشق کے ذریعے نشاط و مستی کا اظہار کرتا ہے جو کافی بالذات ہے اور یہ مجاز اور حقیقت دونوں میں قدر مشترک ہے (۲)

حافظ کے پاس عشق کا اگر کوئی مقصد ہے تو وہ انسانی روح کی آزادی کے سوا کچھ اور نہیں ۔ اقبال بھی روح کی آزادی کا قائل ہے ۔ اس طرح دونوں اس مقصد میں متحد ہیں ۔ البتہ اس مقصد کے حصول کے راستے مختلف ہیں ۔ دونوں نے اپنی شاعری اور وجدانی بصیرت کے توسط سے حقیقت مطلق کا مشاہدہ کیا ہے ۔ دونون کا جمالی تجربہ جذبہ و وجدان سے ہی اپنی غذا حاصل کرتا ہے ۔

حافظ کا جذبہ اور تخیل عشق سے ہمیشہ تابناک رہا ہے ۔ عشق ہی اس کی کیمیا گری کا وسیلہ تھا جس سے خارجی احوال اور اپنے اندرونی روحانی تجربوں میں وحدت پیدا کرتا تھا ۔ اس کی بدولت مجاز و حقیقت کی دوئی کو اس نے دور کیا ۔ مجاز اور حقیقت میں ابہام و اشتباہ کے اشعار ملتے ہیں ۔ ان سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے یہاں جذبات، تجربات اور فنی تقاضوں کی ایک مکمل وحدت تھی ۔ یہی جمالیاتی تخلیق کا اوج کمال ہے ۔ اس کا عشق اس کے فن کی طرح شرح و بیان سے بے نیاز ہے ۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی تصنیف "حافظ اور اقبال" کا ایک مکمل باب اقبال کے تصور عشق کے لیے وقف کر دیا ہے ۔ یہ باب ان کے تنقیدی نظریات کو سمجھنے میں بڑا معاون ثابت ہوتا ہے اس میں انہوں نے بہت ہی شرح و بسط کے ساتھ اقبال کے ان فلسفیانہ افکار اور نظریات کا جائزہ لیا ہے جن میں کہیں اقبال حافظ سے قریب نظر آتے ہیں تو کہیں ان سے مختلف ۔

حافظ کی طرح اقبال کے یہاں مجاز اور حقیقت ایک دوسرے کے ساتھ مربوط و مخلوط ہیں ۔ دونوں کے یہاں تخلیقی توانائی بجائے خود حسین و جمیل ہے ۔ نظریہ فن

کے اعتبار سے بھی اقبال حافظ سے زیادہ مختلف نہیں نظر آتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اقبال وجدان کے ساتھ ساتھ تعقل کا بھی قائل ہے اور تعقل کو تابناک بنانے کے لیے جمالیاتی کیف پیدا کرتا ہے تاکہ کلام کی تاثیر میں اضافہ ہو۔

اقبال کی اس تعقل پسندی کی وجہ سے ہی اس کے یہاں عشق اور عقل کی اختلافی بحث بھی ملتی ہے جو اگرچہ تخیلی ہے لیکن اس سے اقبال نے اپنی فلسفیانہ موشگافیوں میں مدد لی ہے۔ اقبال کے یہاں جب مجازی عشق مقاصد کا عشق بن جاتا ہے تو وہ حقیقت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اقبال نے اپنے مجازی عشق کی نسبت صاف گوئی اور سچائی سے کام لیا ہے۔

اقبال اپنے جذبہ عشق کو عالم فطرت پر بھی طاری کر دیتا ہے۔ عام طور پر انسان اور فطرت کے درمیان ایک خفیف سا پردہ پڑا رہتا ہے۔ شاعر اپنے تخیل اور جذبہ کی بدولت ان حجابات کو اٹھا دیتا ہے۔ کبھی اقبال اپنے جذبہ دروں کو فطرت پر طاری کر دیتا ہے اور کبھی فطرت کے نہاں خانوں میں اپنے درد مند دل کو دھڑکتا محسوس کرتا ہے۔

حافظ کی طرح اقبال کے یہاں بھی عشق کا لازمی نتیجہ سرمستی اور سرشاری ہے اقبال کی مستی اور سرشاری مقصدیت کی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا خیال ہے کہ اس نے مقصدیت کی خاطر کہیں بھی فنی تقاضوں اور شعریت کے حسن کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہی اس کے کلام کی مقبولیت کا راز ہے۔ اس کا تصور عشق اتنا ہی وسیع ہے جتنی کہ خود زندگی۔ وہ زندگی بھی ہے اور زندگی کا جوہر بھی۔ اقبال کے تصور عشق سے یہی تاثر ملتا ہے کہ عشق ہی کی بدولت انسان میں جدت آفرینی اور تخلیق اقدار کی استعداد پیدا ہوئی (۳)

عشق ہی کے بل بوتے پر انسان فطرت کو للکارتا ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق ارتقا۔ کا محرک ہے۔ اس سے جو اندرونی جوش حیات پیدا ہوتا ہے وہ فطرت سے

مُطابقت کی تعلیم بھی دیتا ہے اور فطرت سے نبرد آزما بھی رکھتا ہے۔اقبال کہتا ہے کہ عشق کی روشنی سے مچھلی سمندر کی تاریکی میں اپنا راستہ تلاش کر لیتی ہے۔غرض اقبال کے نزدیک عشق زندگی کی اعلیٰ ترین تخلیقی استعداد ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں حافظ اور اقبال کے شعر کے تعلق سے کہتے ہیں کہ دونوں کے شعر کی روحانی حقیقت ایک دوسرے سے بہت کچھ قریب اور مشابہ ہے۔ ان کے یہاں شاعری شخصیت کا اظہار بھی ہے اور گریز بھی۔ان کے تحت الشعور میں تخیل اور جذبے کے گوندھنے سے جو خمیر اٹھا اسے شعور و احساس نے تخلیقی آب و رنگ میں سمو کر نغمے کی صورت دے دی۔چونکہ ان کے یہاں نغمہ زندگی کی طرح فطری ہے اس لیے اس میں جوش و جذبہ کی باطنی گہرائی ہے۔حافظ اور اقبال کے استعاروں کا ماخذ تعقل نہیں بلکہ لاشعور یا وجدان ہے جو تحلیلی منطق کا پابند نہیں۔ (۴)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے حافظ اور اقبال کے اسلوب بیان کے فرق کو بھی بتلایا ہے وہ کہتے ہیں کہ اقبال اپنے اسلوب بیان میں حافظ کے بہت قریب محسوس ہوتا ہے۔حافظ کے یہاں زیادہ زور تحیر و استعجاب پر اور اقبال کے یہاں استفہام پر ہے۔ اقبال فہم و تعقل کے ذریعے عمل و حرکت کے لیے راستہ صاف کرنا چاہتا ہے جو اس کی اجتماعی مقصد پسندی کا عین ہے۔وہ عرب و عجم کی بوڑھی اور زندگی کی دوڑ میں ہاری ہوئی تہذیبوں کے بدن میں نیا خون دوڑانا چاہتا ہے۔اس کی خواہش ہے کہ یہ تہذیبی زندگی کے سمندر میں بیتاب موج کی طرح متحرک ہو جائیں۔ساحل کی فکر نہ کریں کیونکہ موج کی حرکت ساحل سے بے نیاز ہے (۵)

حافظ اور اقبال کا چوتھا باب ان موضوعات پر مشتمل ہے جن میں اقبال کے نظریات و افکار، عقائد و مسلک، مشاہدہ و محاکمہ وغیرہ جیسے مسائل میں بڑی حد تک حافظ سے مماثلت رکھتے ہیں اور ان امور میں اقبال کو حافظ سے اختلاف تھا اس کی بھی

اس باب میں نشاندہی کی گئی ہے۔یہ باب کتاب کا سب سے تفصیلی باب ہے جو تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے۔اس باب میں جن موضوعات سے بحث کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

علم و فضل، ایمان و یقین، مقام دل، انسانی عظمت، جبر و اختیار، فقر و استغنا واعظ، زاہد اور صوفی، متحرک تصورات، سعی و عمل، ارضیت، دنیا کی بے ثباتی، مقام رضا، قناعت و توکل، حلاج، اہل کمال کی ناقدری، گریہ سحری، تنہائی کا احساس، گل لالہ، رندی اور میکشی کے علاوہ عربی تراکیب اور نبدشیں مثلاً مئے باقی، خونین کفن، ترکی و تازی، شعبدہ باز، راہ نشین، محمود و ایاز، قطرہ۔ محال اندیش، گردش پرکار، شاہد ہرجائی، خانہ۔خدا، عروس غنچہ، لوح سادہ اور ورق سادہ، حق صحبت، خاطر امیدوار، خوب و خوبتر، غبار خاطر، کارگاہ خیال، گیسوئے اردو۔

اس باب کے مطالعہ سے ہمیں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی ناقدانہ نظر اور قوت انتقاد کا احساس ہوتا ہے۔انہوں نے جس تفصیل کے ساتھ موازنے کے لیے کلام حافظ کا مطالعہ کیا ہے حالی اور سرسید کے عہد کے بعد اردو میں شاید ہی کسی ادیب یا ناقد نے کیا ہو۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے ہر عنوان کے تحت حافظ اور اقبال کے اشعار کے حوالوں کی مدد سے اپنے دعوے کو ثابت کیا ہے۔ان تمام موضوعات کا اگر تفصیلی طور پر احاطہ کیا جائے تو وہ اپنے طور پر ایک وسیع مقالہ قرار پائے گا۔اس لیے یہاں پر چند اہم موضوعات تک ہی ہم نے اپنے جائزے کو محدود رکھا ہے۔ان منتخب مثالوں سے بھی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے تنقیدی نظریات کا سراغ مل سکتا ہے۔

علم و فضل

علم و فضل کے تعلق سے ڈاکٹر یوسف حسین خاں حافظ اور اقبال کی علمیت،

ذہانت و فطانت کے تفصیلی مطالعہ کے بعد لکھتے ہیں کہ حافظ اور اقبال میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں نے اپنی زندگی درس وتدریس سے شروع کی ۔حافظ کی طرح اقبال بھی عالم و فاضل شخص تھا ۔حافظ کی طرح وہ بھی اپنے زمانے کے علوم و فنون پر گہری نظر رکھتا تھا خاص کر اسلامی علوم و حکمت میں اسے مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی ۔ اقبال کی شاعری اور فکر دونوں کا محور خودی ہے ۔یہ خودنگری بھی ہے اور خود شناسی بھی اس احساس میں انسانی فضیلت کا راز پوشیدہ ہے ۔حافظ کی طرح اقبال کو بھی روایتی علوم کی بے روح تدریس سے بیزاری رہی اس لیے کہ یہاں روح کی صحیح تربیت اور نشو و نما کے بجائے سارا وقت ظواہر پرستی اور فروعات پر ضائع ہوتا ہے ۔ وہ ایسے علم کا خواہاں تھا جو وجدانی اور روحانی سر چشموں سے سیراب ہو ۔" کرم کتابی اور پروانے " کی گفتگو میں بھی یہی مضمون بیان کیا ہے کہ زندگی کی حکمت کتابوں سے سمجھ میں نہیں آتی اسے سوز و ساز زندگی میں تلاش کرنا چاہیئے ۔

علم کی حد سے پرے بندہ٫ مومن کے لیے
لذت شوق بھی ہے، نعمت دیدار بھی ہے (۲)

حافظ اور اقبال نے ایمان و یقین کے موضوع پر اپنے خیالات کو جس شاعرانہ پیرائے میں بیان کیا ہے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے قلم سے ان کی شاعرانہ توجیہات بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں ۔اس سے جہاں ان کی سخن سنجی اور نکتہ آفرینی کا احساس ہوتا ہے وہیں ان کے تنقیدی شعور کا بھی اندازہ ہوتا ہے ۔اس موضوع پر بھی ان کا قلم بڑی روانی کے ساتھ چلتا ہے اور اسی روانی میں حافظ اور اقبال کے علاوہ رومی اور خیام کے تصوفانہ مسلک کا بھی احاطہ کر لیتا ہے ۔اقبال نے اگرچہ حافظ اور اس کے عہد کے تصوفانہ افکار اور مسلک کی مخالفت کی ہے لیکن اقبال کے ابتدائی دور کا کلام دیکھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ ایمان و یقین کے باب میں اقبال کے عقائد اور حافظ کے عقائد میں بڑی حد تک یکسانیت ہے ۔اس یکسانیت کو ڈاکٹر یوسف حسین

خاں نے خاطر خواہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ وضاحت اگر قدرے تفصیل سے بیان ہوتی ہے تو حافظ اور اقبال کے تصوفانہ مسلک پر اس کتاب کے ایک اہم باب کی شکل اختیار کر لیتی۔

حافظ کے عقائد و خیالات پر مولانا روم اور سعدی شیرازی کے متوازی نقطہ نظر کا اثر نمایاں ہے۔ وہ اسلامی توحید کا قائل تھا نہ کہ وحدت الوجود کا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں کہ اقبال بھی حافظ اور سعدی کی طرح وحدت وجود کا مخالف تھا۔ وہ اسے اسلامی دین و مذہب کے لیے خطرہ خیال کرتا تھا۔ اس کا ذات باری کا تصور تنزیہی ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کے ماورا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ انسانوں سے بے تعلق ہے۔ اقبال کے یہاں ذات باری کا تصور احساس اسلامی سلوک و احسان پر مبنی ہے۔ جس کی رو سے خدا ماورا ہوتے ہوئے بھی انسان کے دل میں براجمان ہے۔ اقبال نے توحید کے عقیدے کو اپنا اور اپنی جماعت کا "سرمایہ اسرار" قرار دیا ہے۔ حافظ کا عقیدہ ہے کہ خدا قادر مطلق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی کے مسائل کا حل اور ان کی گرہ کشائی عقل و تحقیق سے ممکن نہیں۔ حافظ نے کہا تھا کہ جس طرح بندہ خدا کا محتاج ہے اسی طرح خدا بندے کا مشتاق ہے۔ اقبال کا بھی یہی ایقان ہے کہ انسان حق کی تلاش میں ہے اور حق انسان کی جستجو میں ہے۔ اقبال کی طرح حافظ بھی رحمت الہٰی پر ایمان رکھتا ہے۔ دونوں نے ذات باری کی بندگی پر فخر کیا۔ (۷)

انسانی عظمت

اقبالیات کے ماہرین اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ اقبال کے پورے کلام کا حاصل احترام آدمیت و عظمت انسانیت ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے بھی اس عنوان کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے حافظ اور اقبال کے کلام میں ایسے اشعار کو ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے جن سے حافظ اور اقبال کے ان جذبات و افکار کا

پتہ لگایا جاسکے اور جو عظمت انسانی سے متعلق ہیں پھر یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ انسانی فضیلت اور عظمت کے متعلق اقبال حافظ کا ہم خیال ہے۔

اس باب میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے تنقیدی جائزے کا حاصل یہی کچھ ہے کہ حافظ اور اقبال دونوں کو اس بات کا اقرار ہے کہ آدمی کا مقام ساری کائنات سے بلند ہے۔ان دونوں کا خیال ہے کہ انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی عشق پیدا ہوا۔ اقبال کے نزدیک زندگی کے ممکنات کبھی ختم نہیں ہوتے۔انسانی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انہیں ظہور میں لانے کے لیے جد و جہد کرتا رہے۔اقبال اس معاملے میں بھی حافظ کا ہم خیال ہے کہ روز اول سے ہی انسان نے عشق کی بے قراری اپنے اوپر طاری کر لی۔حافظ کی طرح اقبال بھی کہتا ہے کہ حق تعالیٰ انسان کا مشتاق ہے۔اقبال نے حافظ کے برعکس آتش عشق کو اپنی مقصدیت سے وابستہ کیا۔حافظ کے یہاں عشق کی خاطر ہے۔اقبال کے یہاں عشق اجتماعی مقاصد کے لیے ہے۔(۸)

جبر و اختیار

جبر و اختیار نہ صرف علماء و حکماء کا ہی اہم ترین و قدیم ترین موضوع بحث رہا ہے بلکہ یہ وہ موضوع ہے جس کا تعلق راست پیغمبرانہ تعلیمات سے رہا ہے۔جس کو دنیا کے تمام ادیان میں اور الہامی کتابوں میں بھی مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔یہ عمرانی تاریخ کا بھی قدیم ترین موضوع ہے۔ہزاروں سال سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔لیکن آج بھی یہ مسئلہ جوں کا توں حل طلب ہی ہے۔کوئی بات قطعی نہیں کہی جاسکتی کہ انسان مجبور ہے کہ مختار۔اگر مختار ہے تو اس کا دائرہ اختیار کس حد تک وسیع ہے۔شعراء نے بھی اس موضوع کو اپنے اپنے ڈھنگ سے مختلف رنگوں میں باندھا ہے۔اس موضوع پر جو بات میر نے کہی تھی وہ بھی بڑے معرکہ کی تھی ؎

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اس موضوع پر بھی حافظ اور اقبال کے اشعار کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے بڑی دقت نظر کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سعی و عمل کی دعوت کے ساتھ حافظ کو اس بات پر ایقان تھا کہ توفیق الٰہی کے بغیر انسان دو قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اقبال اگرچہ زندگی میں اختیار کے اصول کو مانتا ہے لیکن اسے بھی احساس ہے کہ انسان کے علم کی طرح اس کا اختیار اور ارادہ بھی خدا کی مرضی یا تقدیر کے تابع ہے۔یہاں وہ حافظ سے متفق نظر آتا ہے کہ اگر توفیق الٰہی ساتھ نہ دے تو اس کی ساری کوششیں دھری کی دھری رہ جائیں۔

اسلام میں ایک دور ایسا بھی آیا تھا جب علما۔ اور صوفیا کی تعلیمات کے سبب یہ خیال ہر انسان کے دل میں جاگزیں ہو گیا تھا کہ انسان کی تمام تر زندگی اس کے مقدر کے تابع ہے۔یہ تصور انتہائی خطرناک تھا جو منشائے الٰہی اور اسلامی تعلیمات کے منافی تھا۔ اس میں خرابی یہ تھی کہ انسان ذوق جستجو اور عمل پیہم کی نعمت سے محروم ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس دور کے علما۔ میں امام غزالی کا نام بڑا اہم ہے کہ انہوں نے اسلام میں عمل کی اہمیت کو پوری شدت اور قوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ صوفیا میں مولانا روم نے انسانی ارادے اور اختیار پر زور دیا ہے۔ انہوں نے اپنی مثنوی میں "لیس للانسان الا ما سعی" کی تعبیر بیان کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو قدم قدم پر شر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔یہ شر انسان کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس آزمائش سے وہ اپنی سعی و کوشش سے کامیاب نکلتا ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں پر انسان کے اختیار کا پتہ چلتا ہے۔ حافظ بھی اسی اختیار کا قائل ہے۔ لیکن کہیں کہیں حافظ کے اشعار میں جبر و اختیار کا مسئلہ الجھ بھی گیا ہے۔ جس میں انسان کی سعی کو تقدیر کا تابع بتانے کی بجائے تقدیر کا حریف بھی بتایا ہے۔ یعنی انسان اپنی قوت ارادی

اور حسن عمل سے اپنی تقدیر کو بھی بدل سکتا ہے۔ایسے مقامات پر اقبال اور حافظ کے خیالات میں مماثلت ملتی ہے(۹)

خودی اور بے خودی

خودی اور بے خودی تو کلام اقبال کا حقیقی موضوع ہے۔ فلسفہ خودی اقبال کی دین ہے۔ اقبال سے پہلے جتنے بھی شعرائے متصوفین گزرے ہیں وہ ہمیشہ بے خودی کے قائل رہے ہیں۔خودی کی اصطلاح ان کے یہاں خود نگہ داری یا خود نگری کے مفہوم میں برتی گئی ہیں۔اقبال وہ پہلا شاعر ہے جس نے خودی کے لفظ کو بالکل نئے معنیٰ پہنائے ہیں۔صوفیا مقام نے حقیقت کو پانے کے لیے خودی کے احساس کو مٹانا ضروری سمجھا تھا۔اس کے برعکس اقبال کے تصورات کا یہ مرکزی نکتہ رہا ہے کہ خودی کے بغیر انسانی شعور آزادی اور حرکت کے حصول سے بیگانہ رہے گا۔خودی روحانی وحدت ہے جو مقاصد سے توانائی حاصل کرتی ہے۔

حافظ کا خودی کا تصور اقبال کے تصور سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔اس کے یہاں اجتماعی مقصدیت کا کوئی ذکر نہیں۔اگر چہ وہ وحدت الوجود کا قائل نہیں لیکن دوسرے شعراء متصوفین کی اتباع میں اپنی خودی کو حقیقی اور مجازی محبوب کی مرضی کا جزو بنا دیتا ہے۔ مجازی کی طرح حقیقت میں بھی وہ اپنی خودی سے دستبردار ہونے کو تیار ہے۔

اس موضوع کے تحت ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خودی اور بے خودی کے معاملے میں اقبال، حافظ سے مختلف ضرور ہے مگر یہاں اس اختلاف کے لیے انہوں نے دونوں کے زمانے کے فرق کو وجہ اختلاف قرار دیا ہے لکھتے ہیں:۔

" حافظ کے زمانے میں اس کی انفرادی ذات اس

تہذیب کے چوکھٹے میں محفوظ و مامون تھی جس کے
اندر رہ کر اس نے زندگی گزاری۔اس کے برعکس
اقبال کے زمانے میں انفرادی خودی یا ذات کی
تہذیبی خصوصیات کے مٹ جانے کا اندیشہ تھا۔جو
تاریخی اور سماجی قوتیں کام کر رہی تھیں ان کی زد
کو برداشت کرنا آسان نہ تھا۔ان حالات میں اقبال
نے خودی کے تحفظ اور اسلام کے استحکام کا تصور
پیش کیا۔"(۱۰)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے کس عمدگی کے ساتھ ایک ہی اصطلاح کو دو مختلف عہد میں مختلف حالات کے پس منظر میں پرکھنے کی اور دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔حافظ کے عہد تک خودی کی اصطلاح عاشقانہ رنگ میں کچھ اور معنی و مفہوم رکھتی تھی۔یعنی خودی بے خودی کی حریف تھی اور راہ عشق کے سالک کے لیے وصال محبوب کے راستے میں مانع تھی۔اقبال کے عہد میں خودی کی اصطلاح ایک جداگانہ مفہوم میں برتی گئی ہے۔یہاں وہ بے خودی کی ضد نہیں ہے بلکہ عالم بے خودی، سرمستی و سرشاری کے حق میں "دیدہ۔نگران" ہے اور یہی اقبال کے عہد کا تقاضا بھی تھا۔خودی کے اس لطیف پہلو کی طرف غالباً ڈاکٹر یوسف حسین خاں وہ پہلے ناقد ہیں جن کی نظر گئی ہے۔

فقر واستغناء

حافظ اور اقبال دونوں نے اپنے کلام میں فقر و استغنا کو سراہا ہے۔مرد قلندر کی بے نیازی کی جھلک ان دونوں کی شخصی سیرتوں میں نمایاں تھی۔اسی وجہ سے ان کے اشعار میں بھی اس تعلق سے بڑی حد تک یکسانیت ملتی ہے۔

فقر و استغنا کے مضامین کے لیے اقبال نے فقر و استغنا کو اس حد تک قبول کیا ہے جس حد تک اس کو اپنے فلسفہ ۔ خودی کی تقویت و استحکام کے لیے غذا کی ضرورت تھی ۔ خاص طور پر اقبال نے جہاں کسب حلال کو خودی کے نشو و نما کے لیے لازمی قرار دیا ہے ۔ وہاں اس نے فقر و استغنا اور غنائے حیدری کو بطور خاص باندھا ہے ۔

واعظ ،زاہد اور صوفی

حافظ اور اقبال کے روایتی موضوعات میں واعظ ، زاہد اور صوفی بھی ایسے موضوعات ہیں جن میں بڑی حد تک مماثلت ملتی ہے ۔ یہ دراصل اصطلاحات کے طور پر برتے گئے ہیں ۔ جس سے ان دونوں شعرا. کا مقصد اپنے اپنے عہد کی ظاہر داری اور ریاکاری کے عام رجحان کو بے نقاب کرنا تھا ۔(۱۱)

متحرک تصورات

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے مختلف تنقیدی نگارشات میں ایک بات ہم خاص طور پر محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے فنی تخلیقات اور متحرک تصورات کو ایک خاص اصطلاح میں برتا ہے اور بار بار اس موضوع کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے ۔ حافظ اور اقبال کے موازنے میں بھی انہوں نے ان متحرک تصورات کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے جن سے ان کے کلام میں حرکت اور تغیر کی ایک خاص کیفیت محسوس ہوتی ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ جب گرد و پیش کے حالات فن کار کے ذہن و احساس کو متاثر کرتے ہیں تو اس کے نفس میں حرکت پذیری رونما ہوتی ہے اور جب اس کا تخیل کائنات کو حرکت اور تغیر کی حالت میں دیکھتا ہے تو اس کی تہہ میں زندگی کے حقائق کو بدلنے کا حوصلہ کام کرتا ہے ۔ یہ کیفیت انہیں حافظ اور اقبال دونوں کے کلام میں ملتی ہے ۔ وہ نہ صرف کہ آنے والے زمانے کا خواب دیکھتے ہیں بلکہ دونوں بھی نئے انسان اور نئی انسانیت کو پیدا کرنا چاہتے ہیں ۔ دونوں کو نئے انسان کی تلاش تھی ۔

وہ لکھتے ہیں کہ اس معاملے میں دونوں کے فکر و احساس میں بڑی مشابہت ملتی ہے۔ حافظ اور اقبال دونوں نے اضطراب کے ساتھ زندگی کی توانائی کو سراہا ہے۔اقبال کی طرح حافظ کو بھی شاہیں کی تیزی اور توانائی پسند ہے۔(۱۴)

غرض ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے دیگر موضوعات جیسے سعی و عمل، مقام رضا، احساس تنہائی، رندی و میکشی وغیرہ میں بھی اسی طرز انتقاد سے کام لیتے ہوئے بیشتر موضوعات میں اقبال کو حافظ کا ہم نوا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس باب کا دوسرا حصہ کلام حافظ کی تراکیب اور بندشوں سے متعلق ہے۔ جس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تحقیقی صلاحیتیں تنقیدی شعور کے ساتھ ہم قدم نظر آتی ہیں۔اس میں انہوں نے عرق ریزی کے ساتھ بیشتر تراکیب اور بندشوں کو یکجا کیا ہے جن کو اقبال نے اپنے مخصوص لب و لہجہ، معنی و مفہوم میں برت کر انہیں ایک خاص اصطلاح کا درجہ بخشا ہے۔جو تراکیب اور بندشیں ہمیں اقبال کے کلام میں جا بجا ملتی ہیں انہیں اقبالیات کے ذخیرے میں ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے ان بندشوں اور تراکیب کو کلام حافظ سے ڈھونڈ نکالا ہے اور حافظ کے یہاں انہیں جس مفہوم میں باندھا گیا ہے اس کا موازنہ اقبال سے اور کہیں کہیں تو غالب کے کلام سے بھی کیا ہے۔مثلاً مئے باقی، خونین کفن، محمود و ایاز، قطرہ، محال اندیشہ، خانہ۔خدا، گردش پرکار اور ترکی و تازی وغیرہ۔اقبال نے ان تراکیب اور بندشوں سے اپنے فلسفیانہ موشگافیوں میں بڑی مدد لی ہے۔

اس کتاب کا آخری باب "محاسن کلام" پر مشتمل ہے۔جس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ کلام حافظ اور کلام اقبال کی داخلی محاسن کا اور فنی خوبیوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔اس جائزے میں بھی ان کے تنقیدی نظریات کا سراغ ملتا ہے جن سے وہ شعری تخلیقات کے پرکھنے میں مدد لیتے ہیں۔اس تمام مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں تنقید کے اس دبستان کے زمرے میں شامل ہیں جسے جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کہا جاتا ہے۔

حوالے

---

(۱) ڈاکٹر عبدالمغنی ۔یوسف حسین خان ۔ہماری زبان ۔جنوری ۱۹۸۰ صفحہ (۱۰)
(۲) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔حافظ اور اقبال ۔ماخوذ صفحہ (۳۰)
(۳) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔حافظ اور اقبال ۔ماخوذ صفحہ (۱۶۴)
(۴) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔حافظ اور اقبال ۔ماخوذ صفحہ (۳۴۱)
(۵) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔حافظ اور اقبال ۔ماخوذ صفحہ (۳۹۹)
(۶) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔حافظ اور اقبال ۔ماخوذ صفحہ (۱۷۷)
(۷) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔حافظ اور اقبال ۔ماخوذ صفحہ (۲۰۴)
(۸) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔حافظ اور اقبال ۔ماخوذ صفحہ (۲۳۹)
(۹) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔حافظ اور اقبال ۔ماخوذ صفحہ (۲۵۰)
(۱۰) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔حافظ اور اقبال ۔صفحہ (۲۵۷)
(۱۱) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔حافظ اور اقبال ۔ماخوذ صفحہ (۲۶۰)
(۱۲) ڈاکٹر یوسف حسین خان ۔حافظ اور اقبال ۔ماخوذ صفحہ (۲۷۵)

غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات

"غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات" ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی ادبی تنقید کے ایک طویل سلسلہ ۔ نگار شات میں آخری تصنیف ہے ۔ گویا یہ کتاب ان کے رشحات قلم کا آخری قطرہ ہے جسے اردو ادب کے تنقیدی سرمائے کا گوہر نایاب کہا جاسکتا ہے ۔

یہ کتاب دراصل یوسف صاحب کے ان دو خطبوں کا مجموعہ ہے جو غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام غالب خطبات کے مجوزہ پروگرام کے تحت ۱۹۷۷ء میں ۲۹ اور ۳۱ اکتوبر کو غالب اکیڈمی ہال میں دیئے گئے تھے (۱) ان ہی دو خطبوں کو یکجا کر کے اسے "غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات" کے عنوان سے شائع کیا گیا ۔ افسوس کی بات ہے کہ ۲۱ فروری ۱۹۷۹ء کو ان کا انتقال ہوا اور گویا ان کا کاروان فکر اس معرکتہ الارا تصنیف پر ہی آسودہ ۔ منزل ہوا ۔ اس ادبی کارنامہ کا سہرا ایک لحاظ سے ارباب غالب اکیڈمی کو جاتا ہے کہ ان ہی کے اصرار پر ڈاکٹر یوسف حسن خاں کی یہ تنقیدی تصنیف معرض وجود میں آسکی جس کی تصدیق ڈاکٹر صاحب کے دیباچے سے بھی ہو سکتی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں ۔

"ہر چند میں نے معذرت کی کہ علالت کے باعث

میں یہ فرض نہیں انجام دے سکوں گا میرا کوئی عذر
مسموع نہیں ہوا اور مجھے یہ دعوت قبول کرنی پڑی
غرض کہ میں نے غالب اور اقبال کی متحرک
جمالیات کے موضوع پر دو خطبات دینے کا وعدہ
کرلیا۔"(۲)

اس موضوع پر پہلی بار یوسف صاحب نے ہی قلم اٹھایا تھا جس کی تصدیق مالک رام کے اس تبصرہ سے ہوتی ہے۔

"یہ حقیقت ہے کہ اس موضوع پر سب سے پہلے نظر
بھی ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم ہی کی گئی تھی
اور گزشتہ ۳۰۔۴۰ برس میں انہوں نے نہ صرف
اپنی پرانی تحریروں اور خیالات کو یکجا کیا بلکہ تازہ
غور و فکر سے اس پر بھرپور اضافہ کیا۔"(۳)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یوسف صاحب کے پیش کردہ تصور متحرک جمالیات کے بعد اردو کے تنقیدی ادب میں اس موضوع پر قلم فرسائی کا ایک سلسلہ چل پڑا اور مختلف ناقدین مختلف شعراء کے کلام میں متحرک جمالیات اور پیکر تراشی وغیرہ جیسے موضوعات پر مضامین لکھ رہے ہیں۔اس کتاب میں متحرک جمالیات کا جو تصور یوسف صاحب نے پیش کیا ہے اس کے ابتدائی آثار ہمیں حافظ اور اقبال پر لکھی ہوئی تنقیدی کتاب میں ہی ملنے لگے ہیں۔البتہ اس کتاب میں ان کا یہ تصور اتنا منضبط نہیں تھا جو ان کے ان دو خطبات میں ملتا ہے۔اس کتاب کا پہلا جز ان کے لکچر غالب اور اقبال کے کلام کی ہیئت اور اسلوب پر مشتمل ہے۔اس خطبہ کے موضوع اور مواد سے متعارف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ان دونوں استادوں یعنی غالب اور اقبال نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے مروجہ اسلوب کو ناکافی محسوس کیا اور اپنا ایک نیا انداز بیان ایجاد کیا۔جس میں بلند آہنگی، جوش بیانی اور ندرت و تازگی باہم گھل مل گئے ہیں۔یہ محض ان کے کلام کی آرائش کا وسیلہ نہیں ہے بلکہ ان کی فنی تخلیق اور فکر و تخیل کا جزو لاینفک ہے۔اس اسلوب کی قوت اور توانائی ہمیں حیرت میں ڈال دیتی

ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تراکیب اور بندشیں ان کے خیالات اور معنی کے بطن سے خود بہ خود ابھری ہیں۔ان کے اظہار میں کسی قسم کے تصنع کو دخل نہیں ہے۔ ان کے وجدان کا دھارا انسانوں کی جذباتی زندگی کے لہروں سے بہت قریب ہے۔اس لیے باوجود طرز ادا کے اشکال اور معانی کی گہرائی کے اس کی عالمگیریت میں کمی نہیں آتی۔(۴)

لپنے دوسرے خطبے ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۷ء غالب اور اقبال کے کلام میں "متحرک جمالیات" کے خط وخال بیان کرتے ہوئے یوسف صاحب نے ان استعاروں اور علامتی پیکروں کی نشاندہی کی ہے جن سے حرکت و عمل، آرزومندی اور آزادی کے اقدار کا اظہار ہوتا ہے۔دونوں کے نزدیک انسانی عظمت کا راز دائمی کشاکش اور اضطراب میں پوشیدہ ہے۔غالب نے ایک جگہ کہا ہے کہ سینکڑوں قیامتوں کو پگھلا کر آمیز کیا تو اس سے انسان کا ہنگامہ خیز دل بنا۔اس لیے دل کی ہنگامہ زائیاں روز محشر سے زیادہ ہیں غالب کے یہاں صرف عاشق ہی کا دل ان ہنگامہ زائیوں کا مرکز نہیں بلکہ اس کا محبوب بھی ہنگامہ آرائی سے کچھ کم نہیں چنانچہ خود عشق کی تکمیل کے لیے محبوب کی ہنگامہ آرائی ضروری ہے۔(۵)

اقبال کے کلام میں متحرک جمالیات کو یوسف صاحب نے ایک اچھوتے انداز سے تلاش کیا ہے لکھتے ہیں کہ اقبال کا تصور عشق بھی بے حد متحرک ہے۔اگرچہ اس نے اسے اپنی معصومیت کے تابع کر دیا ہے لیکن باین ہمہ اس سے اس کے فن کی متحرک دل آویزی میں کوئی کمی نہیں آئی اسی "عشق بلا خیز" کی بدولت اس کے کلام میں جوش اور گرمی پیدا ہوئی جو اجتماعی زندگی میں حوصلہ مندی اور امید پروری کی ضامن ہے۔اقبال کے نزدیک انسان کی وجہ تخلیق بھی عشق ہے۔انسان کا یہ مقدر ہے کہ اس کے سینے میں دل کا ننھا سا شرارہ ہو جو عالم میں آگ لگا دے اس کی خاطر انسان کو آزمائشوں میں ڈالا گیا ہے اور اس سے کائنات کا ارتقاء عمل میں آیا اقبال ایسی جنت کا قائل نہ تھا جہاں سکون ہی سکون ہے۔جنت کے متعلق غالب اور اقبال کے خیالات میں حیرت انگیز مماثلت ملتی ہے۔دونوں ایسی جنت کے خواہاں نہیں جہاں سکون و عافیت ہو، بیتابی اور اضطراب نہ ہو، یزدان ہو شیطان ہو (۶) یعنی متضاد

تصورات اور طریقہ عمل ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔

غالب خطبات کے سلسلے کا یہ پہلا لکچر کوئی ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔اس لکچر میں یوسف صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہیئت اور اسلوب جو کسی بھی فن پارے کی صورت گری میں پیمانوں کی طرح برتے جاتے ہیں اور فن پارے کو پرکھنے کی کسوٹی سمجھے جاتے ہیں اگر ان پر کسی بھی فنکار کو ماہرانہ قدرت اور کمال حاصل ہو تو ہیئت اور اسلوب ہی بذات خود ایک تخلیقی توانائی بن جاتے ہیں۔جیسے کائنات کا حسن۔تغیر پذیری کے اپنے فطری عمل سے مظاہر فطرت کی مسلسل و متواتر اور مستقل تزئین وآرائش کرتے رہتے ہیں۔اسی طرح ہیئت اور اسلوب کا خارجی اور داخلی حرکیاتی عمل فن کو تازگی بھی بخشتا ہے، نئے پیمانوں میں بھی ڈھالتا ہے اور ہر لمحہ اس کے حسن کو نت نئے پہلوؤں سے جلوہ ساماں کرتا ہے۔اسی عمل کو یوسف صاحب نے تخلیقی توانائی قرار دیا ہے اور غالب اور اقبال کے کلام میں ہیئت و اسلوب کے اعتبار سے ان پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جن میں تخلیقی توانائیوں کی مماثلت ملتی ہے۔ان کی نظر میں غالب اور اقبال کے خیال و فنی محرکات میں بڑی حد تک مماثلت ہے اور وہ اس بات کے مدعی ہیں کہ اقبال، غالب ہی کے سلسلے کا شاعر ہے۔اس نے اپنے اظہار خیال کے لیے غالب ہی کے پیرایہ۔ بیان کی پیروی کی۔جس میں تخلیقی توانائی بھی ہے اور ندرت فکر بھی۔خود اقبال نے بھی غالب کی شاعرانہ عظمت کا جا بجا اعتراف کیا ہے مثلاً ایک مقام پر وہ کہتا ہے کہ میری دانست میں اسلامی ادبیات میں ہندوستان کے مسلمانوں کا اگر کچھ قابل لحاظ حصہ ہے تو وہ مرزا غالب کی بدولت ہے۔وہ ان شاعروں میں سے تھے جن کی فکر و تخیل انہیں مذہب اور قومیت کی حد بندیوں سے بالاتر کر دیتی ہے۔اقبال کہتا ہے کہ ان کی عظمت کا اعتراف ابھی ہونا باقی ہے۔(۷)۔

یوسف صاحب نے ان شعراء کی نشاندہی کی ہے جن سے غالب متاثر رہے اور اسلوب بیان میں کسی حد تک اتباع بھی کیا ہے اور اقبال نے جن شعراء کے پیرایہ۔ بیان کو اختیار کیا، فکر و تخیل کی خوشہ چینی کی ہے ان کا بھی تجزیہ کیا ہے۔

غالب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ غالب نے میر تقی میر کی استادی کو ماننے کے

باوجود اپنے طرز بیان میں بیدل اور سودا کا بڑی حد تک تتبع کیا ہے کیونکہ غالب نے دلی دکنی اور میر تقی میر کے انداز بیان کو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ناکافی محسوس کیا اس کی دو بڑی وجوہ تھیں۔ایک تو اس کے تخیل کی بلندی، فکر کی گہرائی اور گیرائی اور اس کے جذبہ عشق کی شدت اور حدت کا یہ عالم تھا کہ اسے اندیشہ تھا کہ پیمانہ کہیں تندئ صہبا سے پگھل نہ جائے۔دوسری وجہ اس کی فطری جدت پسندی تھی۔وہ کسی معاملے میں بھی تخلیق کا قائل نہیں تھا اور اپنے فن کے معاملے میں تو وہ از حد حساس تھا۔وہ زمانہ کی عام روش پر چلنے سے اسی لیے مجبور تھا کہ وہ اپنے عہد سے بہت آگے تھا۔اس لیے غالب تمام عمر اس بات کا مدعی رہا کہ وہ بلبل گلشن ناآفریدہ ہے اور اس دعوے میں وہ حق بجانب بھی ہے۔اس لیے کہ وہ غالب جس کو اس کے عہد کے لوگ سمجھنے سے قاصر رہے اس کو عصر حاضر میں سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے اور جس غالب کو آج سمجھا جارہا ہے،بہت ممکن ہے کہ آنے والے دور میں غالب آگہی اور غالب شناسی نئی سمتوں اور نئی جہتوں کو اختیار کرے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ کلام غالب اپنی ہئیت اور اسلوب کی بنا پر نئے دور کے تقاضوں کی تکمیل و تشفی کس حد تک کر سکتا ہے۔اگر غالب اس امتحان میں کامیاب ہو جائے تو یہی اس کی تخلیقی توانائیوں کی ہمہ گیریت اور آفاقیت کی دلیل ہوگی۔یوسف صاحب نے اپنے اس لکچر میں غالب کی اس خوبی کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہئیت اور اسلوب کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> دراصل شاعری میں موضوع سے زیادہ اہمیت پیرایہ اور لب و لہجہ کو حاصل ہے جس میں شاعر کا تخلیقی احساس اور تجربہ سمٹ آتا ہے۔موضوع کو بھی غیر اہم نہیں کہا جاسکتا لیکن انداز بیان اس سے زیادہ اہم ہے اسی شعر میں مخصوص رنگ و آہنگ پیدا ہوتا ہے اور اسی سے وہ پہچانا جاتا ہے۔شاعرانہ ہئیت اسی سے ہے، جدت وندرت اور استعارہ و کنایہ اور علامتی پیکروں کی رنگا رنگی اسی کی بدولت

جلوہ افروز ہوتی ہے۔(۸)

غالب نے اگرچہ قافیہ پیمائی کے بجائے معنیٰ آفرینی کے نظریئے شعر کو شاعری کی شرط اولین قرار دیا تھا لیکن اس کا تمام تر شعری سرمایہ خواہ فارسی ہو کہ اردو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے کہیں بھی یہ احساس نہیں ملتا کہ انہوں نے ہیئت واسلوب اور فن کے تقاضوں سے غفلت برتی ہو۔ان کا تخیل اور ان کی فکر روح اور جسم کی ہم آہنگی کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر خیال معمولی ہو تو ان کا انداز بیان اس کو پر شکوہ بنادیتا ہے۔اسی کو وہ ہیئت اور اسلوب کی تخلیقی توانائی کہتے ہیں۔یوسف صاحب نے ہیئت اور اسلوب کی معجزانہ قدرت کے ثبوت میں چند مثالیں بھی پیش کی ہیں کہ کس طرح شاعر اپنے پیرایہ۔بیان سے کسی بھی مسلک یا عقیدے کو مختلف رنگ دے سکتا ہے اور باتوں باتوں میں اس مسلک کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کو بھی اپنے پیرایہ۔بیان سے خوش اور مطمئن کر سکتا ہے۔اس کی ایک جاندار مثال ہمیں غالب کی اس مثنوی میں ملتی جو انہوں نے خاص دوست مولانا فضل الحق خیرآبادی کی فرمائش پر لکھی تھی۔جس میں اس وقت کے ایک اہم متنازعہ فیہ مسئلہ ممتنع خاتم النبین پر لکھی تھی جو اس وقت کا ایک گرم اختلافی مسئلہ تھا۔غالب اگرچہ ایسے مذہبی مناقشوں سے دور بھاگتے تھے مگر فضل الحق خیرآبادی جیسے عزیز دوست کی بات بھی نہیں ٹال سکتے تھے۔اس لیے انہوں نے اپنی مثنوی میں ایسا پیرایہ۔بیان اختیار کیا جو مسئلہ عقیدہ خاتم النبیین کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں دونوں کے لیے قابل قبول تھا، اس مثنوی کے وہ اضافی اشعار خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو فضل الحق خیرآبادی کی تشفی اور خاطرداری کے لیے لکھے گئے(۹)

یوسف صاحب اس مثنوی کے حوالے سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس میں غالب کے مسلک اور عقیدہ کا کوئی دخل نہ تھا۔ محض اسلوب بیان کی جادوگری نے اس متنازعہ مسئلہ کو معتدل اور ہموار بنادیا۔یہی تخلیقی توانائیوں کی جادوگری ہے۔

یوسف صاحب نے اس لکچر میں اس عمل کی بھی وضاحت کی ہے کہ شعر میں لفظ اور معنی کو الگ الگ نہیں دیکھا جاتا بلکہ ان کے مجموعی اثر کو قبول کیا جاتا ہے۔

غالب اور اقبال دونوں عمل معانی اور بیان میں مہارت رکھتے تھے۔ جس کا اظہار ان کے فارسی اور اردو کے کلام کی مختلف بحروں اور اوزان سے ہوتا ہے۔ دونوں شاعر کو آتش کی طرح مرصع سازی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک یہ ایک روحانی چیز تھی جس میں تقدس کا عنصر شامل تھا۔ جس کا سرچشمہ وجدان اور ماورائے تعقل ہے جس کا اظہار کلام غالب اور کلام اقبال میں جا بجا ملتا ہے مثلاً غالب کہتا ہے ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

اقبال کے نظریات پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک حقیقی شاعر وہ ہے جو اپنے اظہار کی توانائی اور جوش عشق کی بدولت اپنے دل و دماغ پر ایسی کیفیت طاری کرے جسے بیان کرنے پر وہ مجبور ہو جائے۔ یہی کیفیت فن کی جان ہے اور اسلوب اور ہیئت اسی کی دین ہے۔ اقبال نے شاعری کو مقصود بالذات کبھی نہیں خیال کیا وہ اس کے ذریعے سے انسانی تقدیر کے اسرار و موز بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

ہیئت اور اسلوب کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ ہر شاعر اپنے فکر اور تخیل کے تقاضوں کے مطابق پیمانوں کو بدلتا ہے۔ چنانچہ اقبال کو اپنا پیغام عام لوگوں تک پہنچانا تھا اس لیے اس کے بیان میں وضاحت اور پھیلاؤ ہے۔ اس بیانیہ شاعری کے لیے اقبال کو شاعری کے مختلف پیمانوں کو برتنا پڑا۔ اصناف شعری میں کبھی اس نے نظم کو برتا ہے اور کبھی غزل کو۔ لیکن اس کے وجدان کا دھارا انسانوں کی عام جذباتی زندگی سے بہت قریب ہے۔ طرز ادا کے مختلف پیراؤں کے باوجود کلام اقبال کی آفاقیت نمایاں ہے۔ غالب کی بلند آہنگی اس کی فطری توانائی اور داخلی جوش کا اقتضا ہے۔ اس لیے وہ اپنے جذبہ کے فروغ کے لیے باہر کا سہارا نہیں لیتا اور اس نے اپنی داخلی کیفیات کے اظہار کے لیے غزل کے پیمانے کو اس لیے برتا ہے کہ اس میں رمزیت اور ایمائیت کی گنجائش ہے۔ نظم کی سی بیانیہ کیفیت اس کے

لیے لازمی نہیں۔یوسف صاحب غالب اور اقبال کے پیرایہ بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ دونوں کے پیرایہ بیان میں ہئیت موضوع؛ جذبہ اور تخیل شیر و شکر کی طرح گھل مل گئے ہیں۔دونوں میں فرق ضرور ہے۔وہ یہ کہ اقبال کی شاعری کا ایک خاص مقصد ہے۔اس کے بر عکس غالب کی شاعری کو کسی ایک نظام فکر کے دائرے میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔(۱۰)

یوسف صاحب نے ہئیت اور اسلوب کی تخلیقی توانائی کو ثابت کرنے کے لیے غالب اور اقبال کے ایسے بیشتر موضوعات اور مضامین کا بھی تجزیہ کیا ہے جو دونوں کے کلام میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً جذبہ۔ عشق، تصور حیات، جذبہ۔ غم عشق اور حسن، مختلف شعری استعارے، محاسن لفظی و معنوی، وجہ تخلیق کائنات وانسان اور اقبال کا تصور خودی وغیرہ۔ان تمام موضوعات سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دونوں استاد اپنے پیرائے بیان کی ندرت و تازگی میں بے مثل ہیں۔الفاظ ان کے خیالات کو متعین نہیں کرتے بلکہ ان کی شخصیت کی تہوں سے ان کے خیالات ابھرتے ہیں جو الفاظ بھی اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شاعری لفظوں سے ہوتی ہے لیکن ان کی گرفت معانی پر اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ وہ خود بخود ایک مخصوص پیکر میں ڈھل جاتے ہیں۔اسی کو "فنی تخلیق" کہا جاتا ہے۔ معنیٰ آفرینی اور جلوہ صورت دونوں میں شاعر کا اسلوب نمایاں رہتا ہے جو اس کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔اس کے ذریعے سے انسانی روح کی حرکت ظاہر ہوتی ہے۔غالب اور اقبال دونوں میں اندرونی توانائی نکھری ہوئی شکل میں نظر آتی ہے۔

"متحرک جمالیات" ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا دوسرا لکچر ہے جو "غالب خطبات منعقدہ ۳۱/ اکتوبر ۱۹۷۷ء کے تحت دیا گیا۔اس اچھوتے موضوع کے تعلق سے مالک رام نے کہا تھا کہ اس موضوع پر سب سے پہلے ڈاکٹر یوسف حسین خاں ہی کی نظر گئی۔ اس موضوع کے تحت یوسف صاحب نے مطالعہ غالب اور اقبال کو ایک نئی جہت سے روشناس کیا ہے۔فارسی اور اردو کلام کے ناقدین نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی کہ کس شاعر کے یہاں جمالیات کی سکونی کیفیت ملتی ہے اور کس کے یہاں جمالیات کا حرکیاتی تصور ملتا ہے۔ان کے اس لکچر کے تعلق سے ہم کم از کم غالب اور

اقبال کے کلام سے ان عناصر کی یعنی سکونی اور حرکیاتی کیفیتوں کی کھوج لگا سکتے ہیں۔ جمالیات کی تعریف کرتے ہوئے یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ جمالیات فلسفہ کی وہ شاخ ہے جس میں حسن و جمال کی فنی تخلیق پر گفتگو کی جاتی ہے۔ یہ جذبہ و تخیل کی مسرت ہے نہ کہ تعقل کی۔

غالب اور اقبال دونوں کا جمالیاتی تجربہ فکر و وجدان سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔ دونوں نے اپنی شاعری میں حقیقت کا مشاہدہ سکون و جمود کی حالت میں نہیں بلکہ حرکی حالت میں کیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ غالب کی فکر جذباتی اور وجدانی ہے۔ اقبال کے جذبہ و وجدان میں تعقل جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اس نے اپنے فن کو مقصدیت کی تلقین کے لیے وقف کر دیا تھا۔

یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ متحرک جمالیات سے میری مراد شاعری میں ایسے استعاروں اور علامتی پیکروں سے ہے جن سے حرکت اور عمل کا احساس ہو اور یہ احساس حسن آفرین بھی ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ فنکار کے ذہن میں رستخیزی کی کیفیت ہو اور وہ اس کی شدت کو کم کرنے کے لیے فنی تخلیق پر اس طرح مجبور ہو۔ جیسے غنچہ کھلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شاعر کے دل میں احساس اور شعور کی ساری قوتیں سمو جاتی ہیں اور پھر وہ جدانی وحدت بن کر ظاہر ہوتی ہیں یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ غالب اور اقبال دونوں کے یہاں آرزو مندی نے انقلاب اور تغیر کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے (۱۱)

غالب کے پیش نظر قدامت، تقلید اور رسم پرستی کے خلاف انسانی روح کی آزادی تھی جس کی خاطر اس نے بلند آہنگ لہجہ اختیار کیا۔ یہ روح کی آزادی اس لیے تھی کہ اس سے تکمیل ذات کے مواقع میسر آئیں۔

غالب طبعاً حساس اور ترقی پسند طبیعت رکھتے تھے۔ انہوں نے زندگی اور آزادی کی جو فضا کلکتے میں دیکھی تھی اس سے بے حد متاثر ہوئے۔ یہ اثرات ان کے قلب و نظر کی کشادگی کا باعث بنے اور ان کی طرز فکر میں بھی یہ ایک نیا موڑ ثابت ہوا جس کا اندازہ ان کی فارسی مثنوی "ساقی بزم آگہی سے خطاب" اور ان کے بعض مکاتیب سے ہو سکتا ہے، جس میں وہ مغربی تہذیب اور طرز فکر کے مداح نظر آتے ہیں۔ غالب

کے انداز بیان میں جو بلند آہنگی اور للکار کی کیفیت ملتی ہے وہ ان ہی لبرل خیالات کی دین ہے اور یہ خود ان کی طبیعت کا فطری تقاضا بھی ہے۔اس میں قدامت پرستی کے خلاف چاہے وہ معاشرتی ہو یا علمی و ادبی چیلنج ہے۔غالب کا مثالی معاشرہ لبرل خیالات سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔

اقبال کا مثالی معاشرہ اگرچہ اسلامی اصول پر مبنی ہے لیکن اقبال قدامت پرستی اور رجعت پسندی کا کبھی بھی قائل نہیں رہا۔احیا پسندی کے بجائے وہ نشاۃ ثانیہ کا قائل رہا۔اقبال نے حرکت کو زندگی کا مترادف کہا ہے۔اس لیے اس کے خیالات اور افکار میں سکون کی حالت اور جمود کی کیفیت نہیں ملتی۔اقبال کے یہاں حیات اور کائنات کے تعلق سے جو لبرل رویہ ملتا ہے وہ اس کی اجتہادی طرز فکر کی دین ہے۔

غالب کے یہاں صحرانوردی یعنی حرکت اور عمل کو عینی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔غالب کے یہاں وحشت اور جنون کی زنجیر پائی کا تذکرہ ملتا ہے۔اگرچہ اقبال حرکت اور زندگی کو ایک ہی سمجھتا ہے لیکن وحشت اور زنجیر کو نہیں سراہتا۔دشت نوردی میں آبلہ پائی کا تصور غالب کے یہاں بھی ملتا ہے اور اقبال بھی اس نظریہ عمل سے صد فیصد متفق ہے۔غالب کی نظر میں لطف سفر جب ہے کہ راستہ خار زار ہو اور جان جوکھوں میں ڈالنا پڑے ؎

ان آبلوں سے پاوں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

اس جفاطلبی کی تعلیم اقبال کے ہاں بھی ملتی ہے

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

غالب نے اپنے کلام میں موج اور سیلاب کے علامتی پیکروں کو بارہا استعمال کیا ہے جس سے اس کی متحرک تصور جمالیات کی وضاحت ہوتی ہے۔موج رنگ، موج گل، موج شراب اور صرف موج سے علامتی پیکر اور استعارہ کا کام لیا ہے موج، مستی، حرکت اور اضطراب کی نشانی ہے۔سیل اور سیلاب میں شدت عمل کی کیفیت ملتی ہے ؎

نہ پوچھ بیخودی، عیش مقدم سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

غالب کے یہاں موج گل، موج شفق، موج صبا، موج شراب، موج سراب، موج خوں، موج رنگ، موج بہار، موج خرام یار، موج محیط بے خودی، موجہ رفتار موج نگہہ، موج گریہ، موج گہر، موج دود آواز، موج رم آہو، موجہ ریگ، موجہ سبزہ نو خیز، موج تپش جنوں، یہ سب تراکیب بجائے خود موج کی طرح متحرک ہیں۔ ان سے یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ موج کی حرکت سے غالب کے شاعرانہ مزاج کو خاص مناسبت تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ غالب نے لفظ موج کو جو طرح طرح سے علامتی پیکر کی حیثیت سے استعمال کیا ہے یہ اس کے تخیل کے قوت آفرین ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ نیز یہ کہ موج بے تابی اور یقینی تغزل کی رمزنگاری کے لیے بھی سازگار ہے۔

غالب کی طرح اقبال کے یہاں بھی موج اور موجوں کے تلاطم سے، بحر اور بحر کی بے کرانی سے، سیل اور سیلاب سے علامتی پیکروں کی ازل سے ابد تک رواں دواں کیفیت کو بیان کیا گیا ہے اور جہاں عشق کی شدت اور قوت کو بیان کیا ہے وہاں اس نے سیل اور سیلاب سے ہی مدد لی ہے مثلاً مسجد قرطبہ کے ابتدائی بند جو زمانے کے بہاؤ سے متعلق ہیں اس میں اقبال یہی کہتا ہے کہ زمانہ ایک ایسا سیل ہے جس کا نہ رخ موڑا جاسکتا ہے اور نہ جس پر کوئی بند ھ باندھا جاسکتا ہے۔ اس سیل کو کوئی اگر روک سکتا ہے، تو وہ عشق کا سیل ہے جو اس پر بندھ باندھ سکتا ہے چنانچہ کہتا ہے:

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

غالب کے کلام میں انسانی عظمت اور فضیلت کے جو تصورات پیش کئے گئے ہیں ان کا تعلق ان ہی مشرقی اقدار سے ہے جو اسلامی تعلیمات کا حاصل سمجھے جاتے ہیں غالب نے انسانی عظمت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ان روایات کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ انسان کی شان میں فرشتہ کی گستاخی پر بھی معترض ہے اور اپنے پیش رو ایرانی

شعراء کی طرح اس بات پر ایقان رکھتا ہے کہ کائنات کی خلافت کے لیے اور عشق کے بوجھ کو سنبھالنے کے لیے انسان نے جرات مندی کا اظہار کیا وہ خدا کی کسی اور مخلوق کے حصہ میں نہیں آیا۔ اسی وجہ سے انسان کو روز اول سے ایک تغیر پذیر کائنات کی تشکیل وصورت گری اور تصرف کی ذمہ داری اٹھانی پڑی۔ ان مختلف ذمہ داریوں کے لیے غالب نے علامتی پیکروں کو استعمال کیا ہے۔ ان کا مطالعہ گویا غالب کی متحرک جمالیات کا مطالعہ ہے۔

حیات اور غم حیات کے تعلق سے غالب کو یہ اعتراف تھا کہ زندگی کی رونق نت نئے ہنگاموں سے وابستہ ہے۔ غالب کو زندگی میں ہر قسم کا ہنگامہ پسند تھا اگر نغمہ شادی نہیں تو نوحہ غم ہی سہی ؂

ایک ہنگامہ پر موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی

گویا غالب ہر حالت میں زندگی میں ہنگاموں کے قائل تھے۔ ان ہنگاموں کو انہوں نے اپنے کلام میں مختلف پیرائے میں اور مختلف تصورات کے ساتھ بیان کیا ہے اس تنوع کے سبب ان کے کلام میں جمالیاتی حرکت کا احساس ملتا ہے[۱۲۱]

غالب کی طرح اقبال بھی احترام آدمیت اور عظمت انسانی کا قائل رہا ہے۔ اس نے اپنی نظم اور نثر دونوں میں شدت کے ساتھ اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ اگر انسان عمل کے نظریہ پر کاربند رہے اور اس عمل کی بناء پر وہ حق کے راستے پر گامزن رہے تو اس کو دنیا کی تمام مخلوقات پر فضیلت حاصل ہو گی۔ اقبال کی نظر میں اس عمل کو قوت واستحکام بخشنے والی طاقت عشق ہی ہے۔ عشق کا جذبہ جتنا شدید ہو گا حرکت اور عمل کی خواہش بھی اتنی ہی شدید ہو گی۔ غالب کی طرح اقبال نے بھی اپنے تصور عشق اور تصور حیات کو ہر انسان کے دل میں جاگزیں کرنے کے لیے متحرک جمالیاتی کیفیتوں سے کام لیا ہے۔ جس میں جنت اور دوزخ کا تصور، موسم بہار اور خزاں کا تذکرہ، طوفان اور سیلاب، چاند تارے اور سورج، دریاؤں کی روانی، آبشار یہ سب علامتیں شامل ہیں۔ یوسف صاحب نے ان مختلف عنوانات کے تحت متحرک جمالیات کی بحث کو بڑی تفصیل کے ساتھ اور مدلل طریقے سے اٹھایا ہے۔

اس لکچر میں بڑی عرق ریزی کے ساتھ انہوں نے اپنے اچھوتے موضوع یعنی متحرک جمالیات کو پیش کر کے غالب شناسی اور اقبال شناسی کو نئی جہتوں سے متعارف کروایا ہے ۔ جس کا ہر موضوع ایک طویل مطالعہ کا متقاضی ہے بڑی ضرورت ہے کہ اس لکچر کی روشنی میں غالب اور اقبال کے فلسفیانہ افکار اور کائنات، حسن فطرت اور حسن مطلق، جذبہ عشق اور اس کی مختلف کیفیتوں اور تصور انسان اور تصور حیات ان سب کا کلام غالب اور کلام اقبال کی روشنی میں از سر نو مطالعہ کیا جائے۔

حوالے

---

(۱) نوٹ: پہلا خطبہ ہئیت اور اسلوب کی تخلیقی توانائی پر دیا گیا تھا جس کی صدارت مشہور جرمن مستشرق پروفیسر اناماری شمیل (ہارورڈ یونیورسٹی) نے کی تھی۔ دوسرا خطبہ متحرک جمالیات کے موضوع پر دیا گیا تھا جس کی صدارت اردو کے برگزیدہ شاعر پنڈت آنند ناراین ملا نے کی تھی۔ بقول مالک رام دونوں دن (۲۹ اور ۳۱ / اکتوبر) اصحاب علم کی کثیر تعداد نے ذوق و شوق سے خطبات میں حاضری دی۔ وہ نہ صرف ان کی غالب اور اقبال سے دلچسپی کا ثبوت ہے بلکہ خود ڈاکٹر صاحب سے ان کی عقیدت اور اعتماد کی بھی دلیل ہے۔

(۲) ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات۔ دیباچہ۔

(۳) مالک رام۔ تعارف۔ غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات۔ صفحہ نمبر ۶۔

(۴) ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۷

(۵) ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۱۱۱

(۶) ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات۔ دیباچہ۔ صفحہ نمبر ۸۔

(۷) ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۹۔ (بحوالہ اسٹرے ریفلکشنز صفحہ نمبر ۵۱)۔

(۸) ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات۔ صفحہ نمبر ۱۰۔

(۹) خواجہ الطاف حسین حالی ۔ یادگار غالب ماخوذ صفحہ ۳۷۔
(۱۰) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۳۰
(۱۱) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات ۔ ماخوذ صفحہ ۲۷۔
(۱۲) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات ۔ ماخوذ صفحہ نمبر ۱۱۶

राष्ट्रपति भवन नई दिल्ली भारत
RASHTRAPATI BHAVAN NEW DELHI INDIA

February 22, 1979.

My dear Ajmal Khan,

I am deeply grieved to learn of your revered father's demise. His death is a great loss to the world of letters. Please convey my heart-felt sympathy and condolence to your mother and other members of the family.

Yours sincerely,

Sanjiva Reddy

(N. SANJIVA REDDY)

Shri Ajmal Khan,
F/7, Nizamuddin West,
New Delhi.

उप-राष्ट्रपति, भारत.
नई देहली-110011
VICE-PRESIDENT
INDIA
NEW DELHI-110011

February 22, 1979.

Dear Begum Ysuf Husain Khan,

I am deeply grieved to learn of the sad demise of your husband Dr. Yusuf Husain Khan. My heartfelt condolences to you and the members of your family. May his soul rest in peace.

Yours sincerely,

B D Jatti

(B. D. Jatti)

Begum Yusuf Husain Khan,
F-7, Nizamuddin (West),
New Delhi.

12 Willingdon Crescent
New Delhi
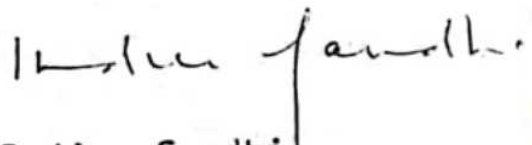
February 23, 1979

Dear Shri Ajmal Khan,

I am grieved to hear of your father's passing away. I can understand your own sorrow. A parent's death leaves a void which can never be filled.

You and your family have my sincere sympathy and condolences in your bereavement.

Yours sincerely,

Indira Gandhi

Shri Ajmal Khan,
F-7, Nizamuddin West,
New Delhi.

Phone :

GHALIB ACADEMY

NIZAMUDDIN WEST, NEW DELHI-110013.

تعزیتی قرارداد

غالب اکیڈمی کا یہ جلسہ عام بلند پایہ مصنف، نامور محقق و مورخ، ماہر غالبیات و اقبالیات اور اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ کے مستقل رکن جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی وفات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور انکے انتقال پرملال کو ایک ناقابل تلافی نقصان سمجھتا ہے۔

مرحوم اپنی بعض دل آمیز خوبیوں کے باعث نیز تہذیبی روایات، اعلیٰ اقدار اور تعمیری فکر و نظر کے ساتھ اپنی گرانقدر علمی و ادبی خدمات کے اعتبار سے عصر حاضر کے دانش وروں میں ایک امتیازی مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کی ۷۶ منزلیں نہایت عزت و وقار کے ساتھ طے کیں۔ طالبعلمی کے زمانہ سے آخر دم تک پورے ذوق و شوق، انہماک و شیفتگی کے ساتھ علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔

ان کی زندگی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ سیاست اور اختلافی امور سے ہمیشہ دامن کش رہے۔ اور صرف ان ہی تنظیموں اور اداروں سے عملی دلچسپی لیتے رہے جو خالص علمی، ادبی، فنی اور ثقافتی کام کررہے ہیں۔ انکی درویش مشی اور زندگی کے ہر پہلو میں بے لوثی نے انکے جاننے والوں میں ان کو اس قدر ہر دلعزیز بنادیا تھا کہ انکے عالمانہ احترام پر انکی ہردلعزیزی غالب رہتی تھی۔ وہ حافظ، غالب اور اقبال کے سچے پرستار تھے۔ خاص طور سے غالب سے انھیں گہری وابستگی تھی۔ غالب اکیڈمی کے قیام کی تحریک سے اس دور میں بھی وہ وابستہ رہے جبکہ اسکا تصور ذہنوں کے نہاں خانوں تک ہی محدود تھا۔ غالب اکیڈمی ۱۹۶۹ میں وجود میں آئی تو اس کے ساتھ انکی صرف نیک خواہشات ہی وابستہ نہیں رہیں بلکہ اسکے استحکام و ترقی میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ ابتدا ہی سے آپ اکیڈمی کی گورننگ باڈی کے ممبر رہے اور تا حیات اپنے پرخلوص مشوروں سے نوازتے رہے۔

وہ ایک وسیع النظر اور بالغ نگاہ ناقد تھے۔ شعر و ادب، تنقید اور تاریخ کے موضوعات پر ان کی تقریباً ۲۵ تصنیفات ہیں جن میں ایک کتاب فرانسیسی میں، گیارہ کتابیں انگریزی میں اور تیرہ کتابیں اردو میں ہیں۔ ان کی کتابوں کے سلسلہ میں یہ بات ایک خصوصیت کی حامل ہے کہ انھوں نے اردو میں اپنی معرکتہ الارا تصنیفات غالب اور آہنگ غالب، روح اقبال اور حافظ اور اقبال کی اشاعت کے کام کیلئے غالب اکیڈمی کا ہی انتخاب کیا اور اکیڈمی نے نہایت افتخار کے ساتھ یہ کتابیں شائع کیں اور خدا کا شکر ہے کہ ان تصنیفات کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ جس کے باعث ان کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا اور انکے ان ادبی کارناموں کو مستقبل کا مورخ سنہری الفاظ میں لکھے گا۔

۱۹۷۷ میں اکیڈمی کی طرف سے غالب خطبات کا سلسلہ شروع کیا گیا تو اکیڈمی کی کونسل نے ڈاکٹر صاحب کا نام ہی تجویز کیا جس کے مطابق اکتوبر ۱۹۷۷ میں انھوں نے "غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات" پر دو خطبے دئے جو زیر اشاعت ہیں۔ ۵ فروری کی صبح کو آپ نے خطبات سے متعلق دیباچہ لکھکر دیا اور اسی دن شام کو اچانک علیل ہوجانے کے باعث ہولی فیملی ہسپتال میں داخل کردئے گئے جہاں ۲۱ فروری کی شام کو یہ باغ و بہار عظیم انسان ہمیشہ کیلئے ہم سے رخصت ہوگیا۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا ارتحال دنیائے اردو کیلئے ایک بڑا غم انگیز حادثہ اور غالب اکیڈمی کیلئے ایک عظیم ذاتی المیہ ہے۔

ہم سب بارگاہ رب العزت میں ڈاکٹر صاحب کی مغفرت کیلئے دست بدعا ہیں اور ملتجی ہیں کہ خداوند کریم ان کے پسماندگان کو اس سانحہ کے تحمل کیلئے ثبات قلب اور صبر جمیل عطا فرمائے۔

ذہین نقوی

(ذہین نقوی)
سکریٹری غالب اکیڈمی
نظام الدین، نئی دہلی

۲۵ فروری ۱۹۷۹ ع

جمال

آج بتاریخ ۲۲ر فروری ۱۹۷۹ء بوقت گیارہ بجے دن، جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے انتقال کے سلسلے میں ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت جناب خان بہادر الحاج عبید الرحمٰن خاں شروانی صاحب، جامعہ اردو میں منعقد ہوا۔ تلاوتِ قرآن پاک کے بعد جناب صدر نے مرحوم کی خدمات پر مفصل روشنی ڈالی۔ اور اراکین و اہلکاران جامعہ کی جانب سے مندرجہ ذیل تعزیتی نوٹ جلسہ میں پڑھا گیا۔

جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب سابق پروفیسر، پرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور سابق شیخ الجامعہ جامعہ اردو، علی گڑھ نے کل مورخہ ۲۱ر فروری ۱۹۷۹ء کی شب دلی میں رحلت فرمائی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

موصوف قائم گنج ضلع فرخ آباد کے اعلیٰ ترین خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ مرحوم صدر جمہوریہ ہند جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم کے حقیقی برادر معزز تھے۔ علم و ادب میں نہ صرف ہندوستان گیر بلکہ عالمی شہرت کے مالک تھے۔ آپ نے پیرس سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ مدتوں ریاست حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد پرو وائس چانسلر کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی میں خدمات انجام دیں۔ اسی دوران جامعہ اردو کے شیخ الجامعہ بھی رہے اسکے بعد دہلی تشریف لے گئے۔

جب جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم نائب صدر جمہوریہ بعد ازاں صدر جمہوریہ ہندوستان ہوئے تو موصوف نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور کبھی اپنے برادر اکبر کے ذاتی رشتہ یا عہدہ سے کوئی سیاسی یا معاشی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ لاتعلق سے رہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی کم و بیش پچیس ۲۵ تصانیف موجود ہیں لیکن روح اقبال، اردو غزل، فرانسیسی ادب، غالب اور آہنگ غالب، حافظ و اقبال نیز انسانیت کا عروج و زوال لازوال اور بے مثل تصانیف ہیں جنھوں نے انکو حیات جاوید بخشی ہے۔ وہ عالم ہندوستان کے پہلے اسکالر تھے جن کو غالب، اقبال اور حافظ شیرازی کا ماہر بلکہ ہر فن مولیٰ دسترس تھی۔ وہ ایک بلند کردار، شریف النفس، انسانیت دوست، علم نواز اور طلباء کے مربی و ہادی تھے۔

آپ کی وفات سے برصغیر کے ادبی حلقہ میں جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کی تلافی کا ہرگز امکان نہیں ہے۔ یہ ادارہ اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور موصوف کے پسماندگان اور خصوصی طور پر پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب، شیخ الجامعہ، جامعہ اردو کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ نیز بارگاہ خدا وندی میں دست بہ دعا ہے کہ خدا وند کریم اپنی رحمت سے مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

اشرف علی
رجسٹرار
جامعہ اردو علی گڑھ

مصنفہ کی پہلی کتاب

ہم کہتے ہیں تم بھی تو سنو

"ہم کہتے ہیں تم بھی سنو" ۔ بساط اردو کی نووارد عالیہ خان کے ۱۷ مضامین کا مجموعہ ہے ۔ان میں چھ مضامین کا تعلق تعلیم کے مسائل سے ہے، کچھ ہمارے معاشرتی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں اور تین سوانحی خاکہ نگاری سے ۔ عالیہ خان کے تعلیمی مضامین ان کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں اس لیے ان میں فکر کی تازگی اور ندرت پائی جاتی ہے ۔ سوانحی خاکوں میں دو کا تعلق ان کے خاندان کے افراد سے ہے یعنی ڈاکٹر ذاکر حسین اور امتیاز حسین خاں ۔اول الذکر ان کے دادا کے سگے بھائی تھے اور ثانی الذکر خود ان کے پاپا (پپا) تھے۔-------------

ان مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے قلم میں جان ہے، عبارت مربوط اور مضبوط ہے اور اگر وہ اسی طرح لکھتی رہیں تو ایک اچھی سنجیدہ مضمون نگار کی حیثیت سے ان کی شناخت ہو سکے گی اور وہ اپنے "قلم کے دھنی" خاندان کا نام اونچا کر سکیں گی

پروفیسر مسعود حسین

سابق پروفیسر عثمانیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی